ماہنامہ

نصرت

لاہور

خاص نمبر
۱۲-۱۳

اسلامی سوشلزم

ماهنامہ نصرت لاہور

مدیر : حنیف رامے

خاص نمبر

اِسلامی سوشلزم

شمارہ : بارہ ، تیرہ

قیمت : دو روپے

طابع : نظر علی شاہ ، مینجر میزان پرنٹنگ پریس ، لاہور

ناشر : محمد حنیف رامے ، البیان ، چوک انارکلی ، لاہور

ترتیب

اداریہ

اسلامی سوشلزم ــ الارض للہ کا مطلوب و مقصود

حنیف رامے

اسلامی سوشلزم ایک قومی بحث ، ۹

حصہ لینے والے

اسلامی سوشلزم

☆

اقبالؒ نے کہا تھا :

''اسلام کے لیے اشتراکی جمہوریت کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا حقیقت میں اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہوگا ۔''

(قائد اعظم کے نام خط / ۲۱ - جون ۱۹۳۷ء)

قائد اعظمؒ نے کہا تھا :

''جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو تو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جاتی ہے ۔''

(تقریر ، چٹاگانگ / ۲۶ - مارچ ۱۹۴۸ء)

صدر ایوب نے کہا تھا :

''معاشی اور معاشرتی شعبوں میں ہماری تمام تر جد و جہد کا صرف ایک مقصد ہو سکتا ہے کہ ہم پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے قیام کی طرف تیزی سے قدم بڑھائیں ۔''

(پیش لفظ ، تیسرا پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ)

حنیف رامے

اسلامی سوشلزم

"الارضُ لِلّٰہ" کا مطلوب و مقصود

قرآنِ عظیم کا فیصلہ ہے کہ زمین اللہ کی ہے (الاعراف : ۱۲۸) - مخلوقِ خدا کے لیے وضع کی گئی ہے (الرحمٰن : ۱۰) - سب حاجت مندوں کے لیے یکساں کھلی ہے (حم السجدہ : ۱۰) - اور اس میں تمام بنی آدم کی بُود و باش اور خور و نوش کا سامان ہے - (البقرہ : ۳۶)

اگر زمین اللہ کی جانب سے سب سائلوں کے لیے عام ہے اور یہ انسان کا مُستقر ہی نہیں متاع بھی ہے تو اسلام میں رزق کے سرچشموں پر کسی کا اجارہ نہیں ہو سکتا ، خلقِ خدا کی ربوبیت کے آگے خود غرض افراد یا گروہوں کو دیواریں کھڑی کرنے کی مہلت نہیں دی جا سکتی -

لیکن آج ہمیں یہ منکرات معروفات میں بدلے نظر آتے ہیں - آج سونا چاندی جمع کرنے والوں کو نہ صرف اس تعزیر کا خوف نہیں رہا کہ اسی سونے چاندی کو آگ میں تپا کر ان کی پیشانیاں ، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی بلکہ اُن کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ ارتکازِ دولت کی علانیہ وکالت کر رہے ہیں ، آج اقامتِ صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کے اٹل رشتے میں دراڑیں پڑ گئی ہیں ؛ آج اسلامی مساوات کے معنی یہ رہ گئے ہیں کہ مسجد میں تو بندہ و صاحب ایک صف میں کھڑے ہو کر عید کی نماز پڑھیں گے لیکن مسجد سے باہر کوئی غنی ہوگا اور کوئی محتاج ؛ آج کتاب عزیز کی وہ آیات عملاً منسوخ ہو گئی ہیں جو ایسے نمازیوں پر لعنت بھیجتی ہیں جو مساکین و یتامٰی سے مروت نہیں کرتے ، جو ایسے مال داروں پر لعنت بھیجتی ہیں جو اپنا مال گن گن کر خوش ہوتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ انہیں کبھی زوال نہ آئے گا ، جو حکم دیتی ہیں کہ اپنی جائز ضرورت سے زائد مال ، دوسروں کی ضرورت کے لیے دے دیا جائے تاکہ دولت معاشرے میں چند امیروں ہی کے ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے -

یہ جس تاریک دن کی تصویر ہے اس میں ہماری صدیوں کی تاریخ اور ہمارا ملی کردار بولتا ہے - وہ اولین اسلامی معاشرہ جو کتابِ منیر کی لاریب تعلیم اور نبی کریم کے اُسوۂ حسنہ کی تابندہ و تازہ مثال کے پیش نظر

قائم ہؤا تھا چند ہی عشروں میں اُس عرب ملوکیت کی زد میں آ گیا جس کی گہری چھاپ آج عرب سے باہر، دوسرے مسلمان معاشروں پر بھی، موجود ہے اور جس سے نجات حاصل کرنا نظریۂ پاکستان کا بہت اہم جزو تھا۔ اقبال نے چنانچہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد میں کہا تھا:

> برصغیر میں ایک جداگانہ اسلامی ریاست ہندوستان کے ساتھ ساتھ اسلام کے لیے بھی انتہائی فائدہ بخش ہے۔ ہندوستان کے لیے یوں کہ اندرونی توازنِ اقتدار کے باعث تحفظ اور امن پیدا ہوگا اور اسلام کے لیے یوں کہ اسے موقع ملے گا کہ عرب ملوکیت کی چھاپ سے نجات پا جائے اور اپنے قانون، تعلیم، ثقافت کو تحریک دے کر انھیں اپنی اصل روح سے قریب لے آئے اور روحِ عصر سے ہم آہنگ کر دے۔

ملوکیت کے سائے میں بیتی ہوئی صدیوں کا سحر، قیامِ پاکستان کے بعد بھی، نہیں ٹوٹا اور ہم نے ابھی تک قانون، تعلیم اور ثقافت کو اس نظر سے نہیں دیکھا کہ وہ کون سا مقام ہے جہاں ہماری معاشرت کے یہ عناصر بیک وقت اسلام کی روح سے سیراب اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

اصل میں ملوکیت یا امپیریلزم خدا کی پھٹکار ہے جو ہبوط آدم سے آج تک ہر اُس معاشرے کا مقدر رہی ہے جو خدا کی نافرمانی کا شیوہ اختیار کرتا ہے۔ اس نظام کی کیفیت وہی ہے قرآن جسے ”بعضکم لبعضٍ عدو“ سے یاد کرتا ہے اور اشتراکیت جسے طبقاتی کشمکش کا نام دیتی ہے۔

بنیادی سوال دو ہیں: کیا ظالم اور مظلوم، غالب اور مغلوب، غنی اور محتاج میں بٹا ہؤا کوئی معاشرہ بنیانِ مرصوص کا درجہ پا سکتا ہے اور کیا وہ معاشرہ جس نے کبھی عثمان اور بلال کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا اور زیردستوں کی آقائی کو ممکن بنا دیا تھا تیرہ تاریک صدیوں کے بعد پھر طلوع ہو سکتا ہے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب ہماری تاریخ اور ہمارا کردار یہ دیتے ہیں کہ ”نہیں“۔ ہم یہ کہنے سے تو باز آئیں گے نہیں کہ اسلام نے معاشی اور معاشرتی عدل و انصاف کی نہایت واضح تعلیم دی بلکہ ہم یہ بھی کہیں گے کہ عدل و انصاف سے آگے بڑھ کر اسلام نے ”احسان“ کا عظیم تصور پیش کیا ہے! مگر ساتھ ہی

ہم عملاً خاموش رہیں گے اور جو ہو رہا ہے اسے مِن جانب اللہ سمجھتے ہوئے مولوی صاحب کے فتوے پر ایمان لے آئیں گے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور اب شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی - مولوی صاحب کہتے ہیں کہ فقۂ اسلامی کے ائمۂ کرام آخر ہم سے تو قرآن و سنت کا بہتر ہی علم رکھتے تھے ، انھوں نے طبقاتی تفریق روا رکھی اور اپنے اپنے دور میں ملوکیت کے علمبرداروں کو یہ بتانا غیر ضروری سمجھا کہ وہ رسول جس کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہم پر لازم ہے کبھی اتنی جائداد نہ بناسکا کہ زکٰوۃ واجب آتی تو پھر ہم کیوں یہ درد بھرا سر اٹھائیں اور اپنے دور کے اُولوالامر کی نظروں میں کھٹکیں! اور مولوی صاحب کی پشت پر تھپکی دینے والا سرمایہ دار کہتا ہے کہ معاشرے کی سالمیت ، وحدت اور یک جہتی کے لیے کونسلوں ، کانفرنسوں اور مذاکروں سے کام چل سکتا ہے تو اقتصادی اور معاشرتی مساوات کی مصیبت کیوں مول لی جائے — دیکھیے نا ! اٹھارہ سال گزر چکے ہیں ملک کو بنے ہوئے ، اب بھلا ہم کیسے پلٹ کر کوئی ایسا نظام اپنا لیں جو امیر کو امیر تر ہونے اور غریب کو غریب تر ہونے سے روکے ؟

عرب ملوکیت کے آغاز میں ابوذر غفاری کی مساوات خیز تعلیم کے جواب میں کعب احبار نے قریب قریب یہی دلیلیں دی تھیں کہ اگر زکٰوۃ و عشر نکال دیا جائے تو خواہ جتنا سرمایہ اور جتنی زمین باقی بچے وہ جائز ہے اور اگر ذاتی ملکیت کا حق تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن کا قانونِ وراثت بیکار ہو جائے گا — اور آج قیام پاکستان کے بعد ، جسے اس عرب ملوکیت کے زہر کا تریاق خیال کیا گیا تھا ، زمانے کی آنکھ ہمارے مولوی صاحب اور ان کے پشتیبانوں کو یہی کچھ کہتے دیکھ رہی ہے -

کیا یہ آنکھ ہماری طرح خاموش تماشائی بنی یہ سب کچھ دیکھتی رہے گی ؟ شاید نہیں - یہ آنکھ اس ملک کے معمار ، قائداعظم محمد علی جناح ، کی اس پیش گوئی پر مسکرا رہی ہے کہ اگر پاکستان کے اہلِ ثروت نے اپنے اطوار نہ بدلے تو جلد ہی غریبوں کا ہاتھ امیروں کی گردن پر ہوگا اور اس وقت کوئی ان کی مدد نہ کرے گا - یہ آنکھ دیکھ رہی ہے کہ وہ سب معاشرے جہاں آج کے دور میں سیاسی اور معاشی جمہوریت کا نام تو لیا جاتا ہے لیکن عملاً ملوکیت اور سرمایہ داری کو کھل کھیلنے کی ڈھیل دے دی جاتی ہے بڑی تیزی سے اشتراکیت کی لپیٹ میں چلے

جا رہے ہیں ۔ یہ تاریخ کا اٹل قانون ہے اور خالق اکبر نے رات اور دن کی گردش کی مثال سے بار بار اہلِ زمین کو خبردار کیا ہے کہ قرار صرف اس معاشرے کو ہے جو "بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" کی مجرمانہ حالت سے ابھر کر باہم اُلفت کے منعمانہ رشتے میں مربوط ہو جائے ـ وہ الفت جسے خدا نے زمین کے سارے خزانوں سے بڑا خزانہ قرار دیا ہے ـ

یہ الفت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے ؟ اس کا طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ اپنے معاملات میں باہم مشورہ کر لیا کرو اور مشورے کی صحت کی کسوٹی یہ مقرر کی ہے کہ جو چیز لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ بخش ہو وہ باقی رہ جائے اور جو نقصان دہ ہو وہ مٹ جائے ـ

اس طریقے کو جی جان سے اپنایا جاتا اور اس کی محض ہونٹ سیوا نہ کی جاتی اور لوگوں سے واقعی مشورہ کیا جاتا تو کبھی ملوکیت یا سرمایہ داری کے حق میں فیصلہ نہ ہوتا اور ایک ایسا معاشرتی اور معاشی قانون ہی وضع ہوتا جو سب کے لیے فائدہ بخش ہوتا ، انسانیت نواز ہوتا، ننگِ انسانیت نہ ہوتا ـ یہ ہو نہیں سکتا کہ لوگوں کے معاملات میں لوگوں سے یا لوگوں کے نمائندوں سے رائے لی جائے اور وہ لوگوں کے فائدے کے بجائے کسی ایک گروہ یا چند افراد کے فائدے کو پیش نظر رکھیں ـ اصل بات اتنی ہے کہ ہم نے اسی کورانہ تقلید کو اپنا شعار بنا رکھا ہے جس کے زیر اثر نبیؐ کریم سمیت ، ہر پیغمبر کو اس کی قوم نے یہ جواب دیا کہ ہم اپنے باپ داد کی روش سے ہٹ کر تمھاری بات کیونکر مان لیں ـ وہ انقلاب جو قرآن کے حرکی پیغام اور نبیؐ کریم کی حکیمانہ تفسیر نے برپا کیا تھا وہ اُن اہل عرب نے خاک میں ملا دیا جن کے بارے میں قرآن نے کہا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائے لیکن منہ سے کہتے ہیں کہ اسلام لے آئے ہیں اور ابھی ایمان ان کے دلوں میں سرایت نہیں کر پایا (الحجرات : ۱۴) ـ ہم نے انھی اعراب کو اپنا قبلہ و کعبہ سمجھا اور اُنھی کی طرح کے منہ زبانی اسلام کو اپنے لیے کافی جانا اور نہ صرف قرآن حکیم کی آیات پر اندھوں اور بہروں کی طرح گر پڑے بلکہ روایت کے دفاتر کی پھپھوندی میں دھنس کر رہ گئے ـ

ہم اجماع، قیاس، اجتہاد کی باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن ملوکیت کی روایت ، جس نے ہماری آنکھوں پر پردہ اور کانوں میں گرانی اور دلوں پر قفل ڈال رکھے ہیں ، ہمیں دو قدم نہیں چلنے دیتی ـ سیاسی غلامی

کے دور میں بے شک ہمارے علماء اور مفکروں کو کسی نئی شریعت کی گنجائش نہ محسوس ہوتی تھی لیکن اب یہ رویہ اتنی تقویت پکڑ گیا ہے کہ عملاً خواہ ہم اپنے سابق آقاؤں اور موجودہ مددگاروں سے مرعوب ہو کر اپنی ہر روایتی روش کا منہ چڑا رہے ہوں لیکن یہ ماننے کی جرأت نہیں رکھتے کہ اسلام کے زندہ و پایندہ دین کے لیے تیرہ صدیوں کی ملوکیت زدہ فقہ پر مبنی شریعت کے بجائے آج ہمیں ایک ایسی شریعت کی ضرورت ہے جو اسلام کی روح کے مطابق تو ہو لیکن عصرِ حاضر سے بھی آنکھ ملا سکتی ہو۔

انسان دین نہیں بنا سکتا کہ دین خالصتاً اللہ کا معاملہ ہے؛ لیکن انسان قانون بنا سکتا ہے۔ دین اور قانون میں وہی فرق ہے جو زمانِ دائم اور زمانِ رواں میں ہے۔ دین ازلی اور ابدی ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا؛ اس میں قوانینِ فطرت کی طرح کوئی تبدیلی نہیں آئے گی (الروم: ۳۰)۔ اس کے برعکس قانون ہر دور میں، زمان و مکان کے ایک خاص موڑ پر، انسانی زندگی کی سطح اور انسانی علم اور حالتوں کے مطابق ہوگا۔ نبیؐ کریم کو جو دین دیا گیا وہی دین نوح، ابراھیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا تھا لیکن ان سب پیغمبروں کی شریعتیں الگ الگ تھیں کیونکہ زمانے کے فاصلوں کا یہی تقاضا تھا۔ لیکن دین کو زمانے سے تطبیق دینے کا کام نبیؐ کریم پر رک نہیں گیا۔ اب یہ کام کتاب اور اسوۂ رسول اور اس کے بعد اجماع، قیاس اور اجتہاد کے ذریعے سے معاشرے کے اہلِ حکمت کی ذمہ داری ہے۔ نبیؐ اکرم کا ایک قول مشہور ہے کہ "میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کا مقام رکھتے ہیں" مگر یہ مقام انہیں اللہ کے دین کو، کہ قرآن کی صورت میں بلا تحریف موجود ہے، نبیؐ کریم کی سکھائی ہوئی حکمت کے ذریعے سے، حالاتِ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے سے، حاصل ہوگا نہ کہ اپنی موجودہ یبوست، اُولوالامر کی کاسہ لیسی اور مریضانہ تقلید سے۔

زمانہ ایک گھوڑے کی مانند ہے اور دین اس گھوڑے کے منہ میں لگام ہے۔ اگر ہم اس گھوڑے پر زین کس لیں اور اس کی لگام کو مضبوطی سے تھام لیں تو ہمارا شمار بھی اہلِ ایمان میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس گھوڑے پر سوار ہونے سے محض اس لیے گریز کرنا کہ یہ نہ جانے ہمیں کدھر لے جائے اسلام کے بارے میں اس اعلان کے برابر ہے

کہ اسلام میں آج کے دور سے عہدہ برآ ہونے کی سکت نہیں - پھر ہم بے شک دین کی لگام کو اپنے گلے کی مالا بنائے پھریں، ہمیں کسی عملِ صالح کی توفیق نہ ہوگی اور مصیبت یہ ہے کہ عمل صالح کی شرط کے بغیر ایمان بھی کوئی معنی نہیں رکھتا - اسی طرح اگر ہم دین کی لگام کے بغیر ہی زمانے کے منہ زور گھوڑے پر چڑھ بیٹھیں تو اغلب ہے کہ یہ ہمیں نامرادی، بے مقصدیت اور جھوٹی مصروفیت کے اُس جہنم میں جھونک دے جس کی آگ آج کے بیشتر معاشروں کے دل چاٹ رہی ہے - زیر بحث موضوع کے تناظر میں اگر ہم معاشی و معاشرتی عدل و انصاف اور احسان کے اسلامی اصولوں کا ورد کرتے رہیں اور ان پر عمل نہ کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری دولت چند ہاتھوں میں گردش کرنے لگے گی اور بقیہ لوگ رزق کے سرچشموں سے فیضیاب نہ ہو پائیں گے اور پھر ہمارے یہاں دورِ حاضر میں برپا ہونے والے اشتراکی انقلابوں کی مثال تازہ ہونے کا وقت آ جائے گا - اس وقت بھوکوں کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہوگا کہ خدا اور رسول تمہارے بھوکے رہنے پر خوش نہ تھے - اُس وقت لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ خدا اور رسول کا نام لے کر ہی تو مولوی صاحب ہمیں بتایا کرتے تھے کہ امیروں پر خدا کی خاص رحمت ہے، ان کی تکریم تم پر فرض ہے؛ تم نماز پڑھا کرو اور روزے رکھا کرو، خدا تمہیں اگلے جہاں میں سونے کا مکان دے گا - پھر وہ سوشلزم چھاؤنی چھائے گی جس میں لوگوں کو روٹی کپڑے کے ساتھ ساتھ، اسی دنیا میں اینٹوں کا ایک مکان بھی ملے گا اور اس میں اتنی جگہ نہیں ہوگی کہ لوگ بھی رہیں اور خدا اور رسول بھی—پھر یہ خبر آئے گی کہ خدا فوت ہو چکا ہے اور جب ذرا آسودگی ہوگی تو سوشلزم کے کسی قائد کو پیغمبر کا درجہ بخش دیا جائے گا اور اس کی شان میں حمد نما گیت گائے جائیں گے اور اس کی تحریروں سے اُس طرح اقتباس دیے جائیں گے جیسے آج کل مسلمان قرآن سے دیتے ہیں -

آج یہ دو انتہائیں ہمیں موت کی آنکھوں کی طرح تاک رہی ہیں - لیکن ہمیں اگر خدا کی وہ کتاب کھولنے کی توفیق ہو جو نبیؐ کریم کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی نازل ہوئی ہے اور اس کی معاشرتی اور معاشی تعلیم پر غور کرنے کی جرأت ہو تو ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک صراط مستقیم بھی واضح ہونے لگتی ہے جس کا نام اقبال نے قائداعظم کو

'' اشتراکی جمہوریت '' بتایا تھا اور قائداعظم نے اس کا نام '' اسلامی سوشلزم '' رکھا تھا ۔ اسلامی سوشلزم دور حاضر میں اسلام کے ازلی و ابدی دین کی روشنی میں مرتب ہونے والی شریعت ہے ــ اسلام کے مدمقابل نہیں ، اسلام کے زیر اثر ؛ اسلام کے دین کے حریف کی حیثیت سے نہیں ، آج کے دور میں اسلام کی تعلیمات کی روح سے سیراب و آب پاش ہونے والی فقہ کے طور پر ؛ زماں و مکاں کے ایک خاص موڑ پر ، ننانوے فیصد غریبوں کے اُس ملک میں جو اسلام کے نام پر بنا لیکن جہاں '' ربّنا آتِنا فی الدنیا حسنتہً کی معنویت کو نظرانداز کرتے ہوئے ، اور دینِ فطرت کے تقاضوں کی آنکھ میں دھول جھونکتے ہوئے ، لوگوں کو اب تک یہ بتایا جا رہا ہے کہ ضروریات زندگی مادی مسئلہ ہے اور اسلام تو انسان کے تزکیے کے لیے آیا ہے ۔

۲

خالقِ اکبر کی رزاقی سے بعید ہے کہ وہ اپنی دوسری ہر مخلوق کو تو رزق بہم پہنچائے اور نیک اور بد ، مومن اور کافر کی تمیز کے بغیر سب کو اپنی وضع کی ہوئی زمین پر پھلنے پھولنے والے سامانِ زیست سے حصہ دے ، ان سب پر یکساں باران رحمت کرے اور ان کی فصلیں پکانے کے لیے دھوپ دے اور ان کی زندگی میں رنگ اور خوشبو بھرنے کے لیے چاندنی بھیجے لیکن خود اہلِ ایمان کی بیشتر تعداد کو چند ذخیرہ اندوزوں ، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے کہ وہ چاہیں تو انھیں جینے کے لیے دو لقمے دے دیں اور چاہیں تو یہ بھی قبض کر لیں ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت فی الارض تفویض کرتے ہوئے اپنی جس صفت کا ذکر کیا ہے وہ رب ہے ''و اِذ قال ربک للملٰٓئکۃِ اِنی جاعلٌ فی الارضِ خلیفہ'' (البقرہ : ۳۰) ۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنے اسمائے حسنہ میں سے قرآن کے مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ جو نام وحی کرتا ہے اُن کا متعلقہ اُمور سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔ وہ حکومت جو اللہ کے نام پر قائم ہو اور اللہ کے نام پر لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرتی ہو جب تک اللہ کی شانِ ربوبیت میں نہیں رچتی بستی اسے لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ۔

چنانچہ تاریخ اسلام کا ہر طالب علم عمرؓ جیسے قہار خلیفہ کو اس فکر میں گھلتے پاتا ہے کہ فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا مجھ سے اس کا بھی مواخذہ کرے گا ۔ انجیل میں ہے جب تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا چاہتے ہو تو تمھارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے بندوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا ؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بولتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں ، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں ، تو بھی تمھارا آسمانی باپ انھیں کھلاتا ہے ، کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے ۔ اسلام خدا کا دین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل ِ اسلام رزق کے سرچشموں سے یکساں فیض یاب نہ ہوں ؟

اگر زمین اللہ کی ہے اور زمین پر انسان کا ٹھکانا اور اسی میں اس کی متاع ِ حیات ہے ، خواہ وہ صنعت و تجارت سے حاصل ہو یا کھیتی باڑی سے یا محنت کشی کے کسی اور اسلوب سے ، تو نجی ملکیت کی بحث یہیں ختم ہو جاتی ہے ۔ اور اگر اعتراض کیا جائے کہ پھر قرآن کے قوانین ِ وراثت کہاں جائیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا تو قوانین ِ وراثت کا مقام وہی ہوگا جو خمار و قمار اور زنا و حرام کاری اور غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق قوانین کا ہوگا ۔ اگر نجی ملکیت کو محض اس لیے قائم رہنا چاہیے کہ قرآن کے قوانین ِ وراثت معطل نہ ہو جائیں تو غلاموں اور لونڈیوں کی تجارت بھی اسلام میں روا رہنی چاہیے اور خمار و قمار اور زنا و حرام کاری بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھنی چاہیے اور یہ بھلا دینا چاہیے کہ نبی ؐ کریم نے زکٰوۃ کے احکام کو معطل ہو جانے سے بچانے کی خاطر اپنی زندگی میں مال جمع نہیں کیا ، بلکہ روح ِ قرآن کے تحت اپنی ضرورت سے زائد مال کو راہ ِ خدا میں خرچ کر کے ، اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہوئے ، زکٰوۃ واجب آنے کی نوبت ہی نہیں آنے دی ۔

قرآن‌عظیم نے نجی ملکیت کے تصور کو جہاں الارض ِ للّٰہ کے ہمہ گیر اُصول سے محصور کیا ہے وہاں سود روا رکھنے کو خدا اور رسول کے خلاف جنگ قرار دے کر اپنی اقل ترین حالت میں محدود ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے تاکہ انسان کی وہ مجرمانہ حالت جو بعضکم لبعض عدو سے عبارت ہے وحی کے اتباع سے سمٹ کر اُس دائرے تک رہ جائے جو انسان

کی نجی یا زیادہ سے زیادہ عائلی زندگی سے تعلق رکھتا ہے ۔ بلکہ یہاں بھی انسان جو کچھ جمع کرتا ہے وہ اپنے لیے نہیں خدا کے لیے کرتا ہے کہ صلوٰۃ و نسک اور موت و حیات سب اللہ کے لیے ہوں تو مال و منال کس کھاتے میں ہیں کہ وہ خدا کے لیے نہ ہوں ، اور خدا کو اپنے لیے تو ان کی ضرورت ہوتی نہیں ، انسان کی ہر بھلائی کی طرح اس کی یہ بھلائی بھی خود اس کے یا اس کے بھائی بندوں کے کام آتی ہے اور یہی بھلائی اس جنت کی تعمیر کرتی ہے جو انسان ، خدا کی دی ہوئی جان اور خدا کے دیے ہوئے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے ، خریدتا ہے ۔

سود کی ممانعت انسان کے لیے ایک راہ بند کرتی ہے اور ایک راہ کھولتی ہے ۔ اب وہ محض سرمایے کے بل پر نہیں جی سکتا اور اب اسے "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کے اصول کے مطابق اپنی محنت پر تکیہ کرنا پڑتا ہے ۔ سود صرف یہی نہیں کہ ساہوکاروں یا بنکوں کی طرح زائد از اصل زر رقم وصول کی جائے ؛ سود کی روح یہ ہے کہ سرمایہ ، خواہ وہ کسی شکل میں ہو ، بلا محنت مزید سرمایہ پیدا کرنے لگے — ایسا جائداد کے معاملے میں ہو یا زمین کے معاملے میں ہو یا رقم کے ۔ سود کی ممانعت اور نجی ملکیت کی آزادی ، یہ دو راستے آپس میں کوئی رابطہ نہیں رکھتے ؛ یہ دو متضاد ، متخالف ، متصادم راستے ہیں ۔ یا سود کی ممانعت ہوگی اور نجی ملکیت پر تحدید ، یا نجی ملکیت کو کھلی چھٹی ہوگی اور سود کی ممانعت کا ذکر طاق میں دھرے ہوئے ، جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن شریف کے اندر بند ۔ حرمتِ سود کے پیچھے قرآن کی جو حکمت ہے اُسی کے تحت حضرت عمر نے حضرت بلال سے زمین کا وہ قطعہ واپس لے لیا تھا جو انھیں نبی کریمؐ نے عطا کیا تھا لیکن جسے وہ خود زیرِ کاشت نہ لا سکے تھے۔

جب ہم اسلام کے بخشے ہوئے معاشرتی اور معاشی رویوں پر غور کرتے ہیں تو ہم پر کھلتا ہے کہ جس طرح اسلام نے اپنے اندر جمہوری اقدار سمو رکھی ہیں اسی طرح اشتراکی رجحانات کو ان کا جائز مقام بھی دے رکھا ہے ۔ جب اقبال نے قائد اعظم کو اشتراکی جمہوریت سے متعارف کرانا چاہا تھا تو جہاں یہ یقین دلایا تھا کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو معاشی ضروریات کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے وہاں یہ وضاحت بھی کی تھی کہ اشتراکی جمہوریت اسلام سے بہت قریب ہے اور اس پر عمل درآمد کوئی بدعت نہیں

بلکہ اسلام کی حقیقی روح کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے (قائد اعظم کے نام خط — ۲۸ / مئی ۱۹۳۷ء) -

اسلام کی اقتصادی اور معاشرتی مساوات پر ہمارے یہاں اقبال سے پہلے شاہ ولی اللہ بھی روشنی ڈال چکے ہیں - انہوں نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں تنذیر کی تھی :

> انسانیت کے اجتماعی اخلاق اُس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے - اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے - جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے - ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اُتار دے -

ہم نے اپنے دور میں روس اور چین ہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک میں بھی اس اقتصادی جبر کے خلاف انقلاب آتے دیکھے ہیں - سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقدر ہو چکا ہے کہ یہ انقلاب اسلام کی انقلاب آفرین معاشرتی و معاشی تعلیم کو پس پشت ڈال کر آئیں ، یا اجتہاد کے دروازے کو کھول کر آج کے دور کی جائز انسانی امنگوں کو اسلام کی حدود میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے ؟ اقبال نے اپنے جس لیکچر میں یہ کہا تھا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی بات محض ایک افسانہ ہے اسی میں اس نے ہماری توجہ اس حقیقت کی جانب بھی دلائی تھی کہ اسلامی دنیا کے آس پاس اشتراکیت کی صورت میں جو نیا اقتصادی تجربہ کیا گیا ہے اس سے اسلام کے مقدر اور اس کی اصل روح کے بارے میں ہماری آنکھیں کھل جانی چاہییں - اقبال نے تو اس نظام کے بارے میں یہاں تک کہا تھا کہ اگر اس میں خدا کا تصور شامل ہو جائے تو یہ قریب قریب عین اسلام بن جاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت کے تصور سے اسلام شناسا ہی نہیں بلکہ اس کے معاشی اور معاشرتی پروگرام کا ہمیشہ سے داعی رہا ہے ، اور یہ تصور ہمیں اُتنا ہی قبول ہے جتنا جمہوریت کا تصور - اگر ہم قرآن سے جمہوریت کے لفظ کی سند نہیں لا سکتے اور اپنے ملک کا نام اسلامی جمہوریہ رکھ

سکتے ہیں تو اسلامی اشتراکیت یا اسلامی سوشلزم میں کیا قباحت ہے کہ ہم محض نام سے گھبرا جائیں اور اس کے پیچھے سرسراتی ہوئی روح قرآن سے گریز کی راہیں تلاش کرنے لگیں۔

اشتراکیت کی ایک عمومی تعریف یوں کی گئی ہے :

> اشتراکیت ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرتی نظام ہے جس میں ذرائع پیداوار عوام کی ملکیت میں ہوتے ہیں اور معاشرے کے تمام ارکان میں مکمل معاشرتی مساوات ہوتی ہے۔ اس کے تحت عوام کی ہمہ گیر ترقی کے شانہ بشانہ سائنس اور کاریگری کی متواتر ترقی کے ذریعے سے پیدا کار قوتوں کی نشو و نما بھی ہوگی ، اجتماعی دولت کے تمام چشمے فراوانی سے بہیں گے اور ''ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لینے اور ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق دینے'' کے عظیم اصول پر عمل درآمد بھی ہوگا۔ اشتراکیت آزاد اور معاشرتی شعور رکھنے والے محنت کش عوام پر مشتمل ایک انتہائی منظم معاشرہ ہے جس میں لوگوں کی اپنی حکومت قائم ہوگی اور جس میں ہر شخص سے قوی اور اولین مطالبہ یہ ہوگا کہ وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے محنت کرے اور یہ مطالبہ ایسا ہوگا کہ ہر شخص بلا تخصیص اسے قبول کرے گا اور ہر شخص کی صلاحیت لوگوں کے بہترین فائدے میں صرف ہوگی۔

(سوویٹ روس کی اشتراکی پارٹی کا بائیسواں اجلاس : ۱۹۶۲ء)۔

کیا اس میں کوئی بھی ایسی بات ہے جس کی اسلام اجازت نہ دیتا ہو بلکہ کیا یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں جو لوگوں کے فائدے کی ہوں اور لوگوں میں عداوت کے بجائے الفت پیدا کرتی ہوں۔ سنا ہے اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباھی۔ پھر نہ جانے ہم سوشلزم کے تصور کو دین کا حصہ جانتے ہوئے اس کے نام سے کیوں کانپتے ہیں ؟ کیا محض اس لیے کہ ہم اٹھارہ سال سے سرمایہ داری نظام کی درد انجامیوں میں گرفتار ہیں اور اب راستہ بدلنا ممکن نہیں ؟ کیا یہ اٹھارہ سال کی مدت اُن ایک ہزار سال کی مدت سے زیادہ ہے جو ہم نے برصغیر ھند میں ہندوؤں کے ساتھ کاٹے تھے اور جن کے باوجود اُس جداگانہ ملک کا مطالبہ

کیا تھا جس کے حصول میں ہم نے پلاسی سے پاکستان تک انگریز اور ہندو سامراجیت سے صبر آزما اور خون آشام ٹکر لی تھی اور جس کے نتیجے میں آج بھی لاکھوں کشمیری اور کروڑوں بھارتی مسلمان برہمنی سامراج کے رحم وکرم پر ہیں ؟ اگر خداوند کریم نبیؐ کریم کو ایک ایسی قوم میں مبعوث کرنا روا رکھتا ہے جس پر پہلے کبھی وحی نہ آئی تھی اور وہ قوم ایک حقیقت کو پہچان کر اپنی ازلی روش سے منحرف ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتی ہے تو کیا یہ بدقسمتی پاکستان کے مسلمانوں ہی کا حق ہے کہ وہ ملک تو خدا کے قانون کے نافذ کے لیے بنائیں لیکن وہاں حکمرانی اس عداوت خیز طبقاتی تفریق کی ہو جو خدا نے انسان پر اس وقت مسلط کی تھی جب وہ شیطان کے پھسلانے میں آیا تھا ۔

اس المناک سوال کا عملی جواب بہت ہولناک ہے لیکن انسان کو امید سے کنارہ نہ کرنا چاہیے ۔ گذشتہ چند سالوں نے امید کی ایک کرن پیدا بھی کی ہے ۔ یہ کرن چین سے ہمارے روابط کا ثمر ہے ۔ امید یہ ہے کہ ہم پر نبیؐ کریم کے اس قول کی حقانیت واشگاف ہونے کے دن آ گئے ہیں کہ ”اُطلبوا العلم ولو کانَ بالصین ۔ محض اپنی معاشرتی اور معاشی اصلاح کر کے ہمارے ہمسایہ اشتراکی ملک نے اپنے یہاں جتنی اخلاقی اور سیاسی ترقی کی ہے وہ اس دور میں ہم نے اپنی بغلوں میں قرآن حکیم رکھتے ہوئے بھی نہیں کی ۔ عالم یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ چین سے ہو آتے ہیں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم خلافت راشدہ کے دور میں سانس لے رہے ہیں ۔ کیا خلافت راشدہ کی روح پر دور حاضر میں چین کا اجارہ طے ہو چکا ہے ؟ کیا آج کے دور میں خدا اور رسول سے اس روح کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے ؟ ــ یہ ماننے کی جرأت مجھ میں نہیں کیونکہ جس خدا کی آواز قرآن کے آہنگ میں موجزن ہے اور جس نبی کا اسوہ قرآن کے اوراق میں محفوظ ہے وہ زمین پر چند عشروں کے لیے ظہور میں آنے والی خلافتِ راشدہ ہی نہیں ایک سدا سر سبز و شاداب جنت کی نوید دیتے ہیں ــ شرط ہے تو اتنی کہ خدا کی زمین پر ہم خزانے کے سانپ بن کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ خدا کی زمین کو خدا کی مخلوق کی ربوبیت کے لیے عام کر دیں تاکہ خدا کی زمین خدا کے نور سے بھر جائے ۔

ایک قومی بحث

اسلامی سوشلزم

[۲۵ جون ۶۶ء کے اخباروں میں قومی اسمبلی کی روداد کے حوالے سے ایک خبر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی کہ ایوان کے رکن جناب عبدالکریم سومار نے اسلامی سوشلزم کے تصور کو اسلام کے ساتھ بہت بڑا فراڈ قرار دیا ہے۔ اس پر ۲۹ جون ۶۶ء کے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں جناب عبداللہ حر نے ایک مضمون کی صورت میں جوابی حملہ کیا کہ اگر اسلامی سوشلزم فراڈ ہے تو یہ فراڈ کون کر رہا ہے؟ اور پھر لاہور اور کراچی کے اخباروں میں یہ بحث چل نکلی۔ اگر سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر جناب ایس اے حسنی کی ایک تقریر نے اسلامی سوشلزم کے حامیوں کا حوصلہ بلند کیا تو نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری غوث بخش بزنجو نے اسلامی سوشلزم کے بجائے مارکس اور لینن کی سوشلزم ہی کو ملک کے مسائل کے لیے امرت دھارا قرار دے کر محتاط لوگوں کو سوشلزم کے لفظ سے بدکانے میں حصہ لیا۔ بحث نے اتنا زور پکڑا کہ آخر سومار صاحب کو ایک مفصل مضمون لکھ کر اپنے موقف کی وضاحت کرنی پڑی۔ اب اس بحث نے سنجیدہ علمی رنگ اختیار کر لیا اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے]

ادارہ

خبر

اسلامی سوشلزم کا تصور اسلام کے ساتھ بہت بڑا فراڈ ہے

قومی اسمبلی میں مطالبات زر پر بحث کے دوران مسٹر سومار کی تقریر

روزنامہ مشرق ، لاہور ، ۲۵ جون ، ۶۶ء

راولپنڈی ، جمعہ - کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین مسٹر عبدالکریم سومار نے پاکستان میں سوشلزم پر مبنی نظام رائج کرنے کا تجربہ کرنے کی مخالفت کی ہے - انھوں نے کہا ہے کہ اسلامی نظام پاکستان اور انسانیت کے لیے واحد راہ نجات ہے - انھوں نے مزید کہا کہ اسلام سوشلزم سے کئی سو سال پرانا نظام ہے اور اسے کسی دوسرے نظام یا فلسفے سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے -

مسٹر سومار آج وزارت خزانہ کے مطالبۂ زر میں کٹوتی کی ایک تحریک پر تقریر کر رہے تھے - یہ تحریک حزب اختلاف کے ڈپٹی لیڈر شاہ عزیزالرحمان نے پیش کی تھی -

شاہ عزیزالرحمان نے اپنی تحریک کی حمایت کرتے ہوئے پاکستان میں سوشلزم کو اپنانے پر زور دیا اور مطالبہ کیا کہ تمام بنک ، انشورنس کمپنیاں اور اہم صنعتیں قومی ملکیت میں لے لی جائیں - انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ ان اداروں کو قانون بنا کر پرامن طریقے سے قومی ملکیت میں لیا جاسکتا ہے -

مسٹر عبدالکریم سومار نے شاہ عزیزالرحمان کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو مروجہ اقتصادی نظام اپنائے ہوئے اٹھارہ سال ہو چکے ہیں اور اب ہم ترقی کر کے اتنا آگے جا چکے ہیں کہ موجودہ نظام میں تبدیلی کا تجربہ کرنے سے گزشتہ ساری ترقی ضائع

ہو جائے گی ۔ انھوں نے اسلامی سوشلزم کو ایک خطرناک تصور اور اسلام کے ساتھ بہت بڑا فراڈ قرار دیا اور کہا کہ اسلام کو سوشلزم سے ملانا سخت غلطی ہے ۔

مسٹر سومار نے کہا کہ شاہ عزیزالرحمان نے اپنی ساری تقریر میں میری گزشتہ تقریر کا بار بار حوالہ دیا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ سوشلزم تمام مسائل کا واحد حل ہے ۔ حالانکہ گزشتہ سال انھوں نے اس کی مخالفت کی تھی ۔

اسلامی سوشلزم کے نعرے کو اسلام کے ساتھ فراڈ قرار دیتے ہوئے مسٹر سومار نے سوشلزم کے ارتقا کی تاریخ بیان کی ۔ انھوں نے کہا کہ بعض فرانسیسی مفکروں نے دو سو سال پہلے سوشلزم کا خاکہ مرتب کیا تھا اور کمیونزم کے بانی کارل مارکس نے بعد میں اس خاکے پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھی تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوشلزم صرف دو سو سال پرانا نظام ہے ۔ لیکن اسلام اس کے مقابلے میں تیرہ سو سال پرانا نظام ہے ؛ اس نے سوشلزم سے کچھ نہیں لیا چونکہ وہ نہ صرف سوشلزم سے پرانا ہے بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات بھی ہے ۔ اسے کسی دوسرے نظام یا فلسفۂ حیات سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام کا سرچشمہ قرآن ہے ۔ اس بنا پر اسلام اور سوشلزم کو یکجا کرنا غلط ہے ۔

مسٹر سومار نے کہا کہ شاہ عزیزالرحمان نے پاکستان میں سوشلزم کو اپنانے کے لیے کئی ملکوں کی مثالیں پیش کی ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ میں سوشلزم یا ان ملکوں کا دشمن نہیں ہوں جنھوں نے اس نظام کو اپنایا ہے ۔ کارل مارکس نے یورپ میں غربت اور افلاس دیکھنے کے بعد ایک نئے نظام کی تشکیل کے نظریات مرتب کیے تھے لیکن ان نظریات پر یورپ میں نہیں بلکہ ایک پسماندہ زرعی ملک روس میں عمل کیا گیا ۔ وہاں گزشتہ ۴۰ سال سے سوشلسٹ نظام پر عمل کیا جا رہا ہے ۔ لیکن اب اس کی صورت میں تبدیلی ہو گئی ہے ۔ اگر کارل مارکس آج موجود ہوتا تو وہ بھی اپنے نظریات تبدیل کر لیتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشلزم اپنی افادیت کھو بیٹھا ہے ۔

مسٹر سومار نے کہا کہ روس کے ماہرین معاشیات چالیس سال تک سوشلزم پر عمل کرنے کے بعد اب یہ کہہ رہے ہیں کہ انھیں معیشت میں منافع کے محرکات کو بحال کرنا پڑے گا ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ منافع کے محرکات پر مبنی نظام نتائج کے اعتبار سے زیادہ بارآور ثابت ہؤا ہے ۔

انھوں نے کہا کہ پاکستان گذشتہ ۱۸ سال سے ایک نظام پر عمل کر رہا ہے اور اب ہم ترقی کے ایک ایسے موڑ پر آ گئے ہیں جہاں سے پیچھے جانا ممکن نہیں ۔ یہ ہو سکتا تھا کہ شروع میں ایک مخصوص نظام اپنا لیا جاتا لیکن اب مروجہ نظام میں تبدیلی کرنے سے گذشتہ ترقی ضائع ہو جائے گی ۔

چین کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چین نے شروع سے سوشلسٹ نظام اپنا رکھا ہے اور اس کی ترقی قابلِ قدر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس وقت چین بھی اپنے نظام میں تبدیلی کرنا چاہے تو اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا ۔

مسٹر سومار نے افسوس ظاہر کیا کہ شاہ عزیزالرحمان نے بعض ایسے ممالک کی مثال پیش کی ہے جو ترقی میں پاکستان سے پیچھے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اس وقت دنیا میں ترقی کی درخشاں مثال ہے اور ہمیں صرف ان ملکوں کی تقلید کرنی چاہیے جو ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں ۔

اپنی تقریر کے آخر میں مسٹر سومار نے اس بات کی وضاحت کی کہ پاکستان کے لیے کونسا نظام اچھا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام سوشلزم سے بہتر ہے لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے میں اسلامی نظام کو ان دونوں نظاموں سے بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ اسلامی نظام اپنانے میں نہ صرف پاکستان بلکہ ساری انسانیت کی نجات بھی مضمر ہے ۔

اس سے قبل شاہ عزیزالرحمان نے اقتصادی مساوات اور معاشرتی انصاف کے لیے سوشلزم کو اپنانے پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ سوشلزم اس دور کا نعرہ اور سب سے بڑا جذبہ ہے اور اسے نہ اپنانے سے ہم پیچھے رہ جائیں گے ۔ انھوں نے سوشلزم کی مختلف صورتوں کی تفصیلات بتاتے

ہوئے کہا تھا کہ یہ نظام پرامن طریقے سے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ کرتے ہوئے شاہ عزیزالرحمان نے کہا تھا کہ یہ کام قانون بنا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

مضمون

کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے؟

اگر فراڈ ہے تو فراڈ کون کر رہا ہے؟

عبداللہ حُر

روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۹ جون ۶۶ء

قومی اسمبلی کے رکن، نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین اور کراچی کے ابھرتے ہوئے صنعت کار و تاجر اے کے سومار صاحب نے ۲۴ جون ۱۹۶۶ء کو قومی اسمبلی میں اعلان کیا ہے کہ اسلامی سوشلزم ایک بہت بڑا فراڈ ہے اور سومار صاحب کا یہ اعلان ٹرسٹ کے سبھی اخبارات نے بڑے نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ اے کے سومار صاحب اُن نوواردانِ بساطِ سیاست میں سے ہیں جن کے لیے ترقی کی سیڑھی روپے کے بل پر استوار ہونے والے تعلقاتِ خصوصی نے وضع کی ہے اس لیے ان سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ اقبال اور قائداعظم یا کم از کم لیاقت علی خاں ہی کے افکار و خیالات اور بیانات سے آگاہ ہوں گے، جن کے یہاں سے اسلامی سوشلزم کا تصور ہماری نسل تک پہنچا ہے لیکن اُن سے یہ امید ضرور کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے سیاسی قائد فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے واضح اعلانات سے باخبر ہوں گے۔ صدر ایوب خاں کے انتخابی منشور کے بارے میں شاید سومار صاحب یہ سمجھتے ہوں کہ انتخابات جیتنے کے لیے ساری دنیا میں امیدوار ایسے وعدے وعید کرتے آئے ہیں جنھیں پورا کرنا مقصود نہیں ہوتا اس لیے کہ اگر ایسے وعدے پورے کر دیے جائیں تو حکمرانوں کو بعض ایسے فوائد سے دست بردار ہونا پڑتا ہے جن کی خاطر ہی تو انھوں نے دراصل انتخابات کی صعوبت مول لی ہوتی ہے لیکن سومار صاحب کو سرمایہ‌داری نظام کے نقیب کی حیثیت سے صدر ایوب خاں کے اُس بیان کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے تھا جسے موصوف

تیسرے پنج سالہ ترقیاتی منصوبے کے پیش لفظ کے طور پر ضبطِ تحریر میں لا چکے ہیں ۔

عوام کو اس پنج سالہ ترقیاتی منصوبے سے کیا فائدہ پہنچتا ہے ؟ یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے لیکن اس منصوبے میں سرمایہ‌دار طبقے کی ترقی کا سامان لازماً موجود ہے۔ اس لیے حیرت کا مقام ہے کہ سومار صاحب جوشِ تقریر میں اس صحیفے کو کیونکر پس پشت ڈال گئے ؟ کیا ان کے خیال میں ''بیمار وزیر خارجہ'' کی خالی جگہ لینے کے لیے تیز تیز بیانات اتنے ہی ضروری تھے کہ وہ یہ بھی بھول گئے کہ اس تیزی میں انھوں نے اسلامی سوشلزم پر فراڈ ہونے کا جو الزام لگایا ہے اس کی زد براہ راست ان کے جماعتی قائد پر پڑتی ہے ، کیونکہ لیاقت علی خاں کے بعد صدر ایوب ہی نے اس تصور کو اپنے بیانات میں نمایاں جگہ دی ہے جس کی سب سے نمائندہ مثال تیسرے پنج سالہ ترقیاتی منصوبے کا پیش لفظ ہے ۔ یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں سومار صاحب یہ تاثر تو نہیں دینا چاہتے کہ صدر ایوب کے انتخابی منشور بلکہ ان کے بنائے ہوئے اور نافذ کیے ہوئے دستور میں سماجی اور اقتصادی انصاف کے اسلامی تصور کو بروئے عمل لانے کا وعدہ موجود تو ہے لیکن قابل عمل نہیں ؛ اسی طرح اسلامی سوشلزم بھی صرف ''دکھانے'' کے لیے ہے ''کھانے'' کے لیے نہیں ۔ اس طرح یہ تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی سوشلزم ایک فراڈ ہے لیکن سومار صاحب عجلت میں یہ بھول گئے ہیں کہ اسلامی سوشلزم کے حق میں ان کے قائد صدر ایوب کے اعلانات و فرمودات کی موجودگی میں لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ یہ فراڈ کون کر رہا ہے ؟ صدر ایوب کے بارے میں لوگوں کو اکثر یہ خیال رہا ہے کہ وہ خود تو اچھا ہی سوچتے ہیں لیکن ان کے مشیر ، اہل‌کار اور ترجمان ان کے نادان دوست ہیں ۔ مشیروں ، اہل‌کاروں اور ترجمانوں کی اس فہرست میں سومار صاحب نے یہ بیان دے کر اپنا نام سب سے اونچا لکھوا لیا ہے ۔

صدر ایوب خاں نے تیسرے ترقیاتی منصوبے کے پیش لفظ کے تیسرے صفحے کی چوتھی اور پانچویں سطر میں لکھا تھا :

'' معاشی اور معاشرتی شعبوں میں ہماری تمام تر جدوجہد کا صرف ایک

مقصد ہو سکتا ہے کہ ہم پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے قیام کی طرف تیزی سے قدم بڑھائیں۔ "

صدر محترم نے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ اسلامی سوشلزم کا تصور فلاحی مملکت کے تصور سے وسیع تر ہے کیونکہ اس میں ہمارے عقاید اور روایات کے تحفظ کا سامان بھی موجود ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک کہا تھا

" اسلامی سوشلزم کے قیام کی بنیادی شرط یہ ہے کہ سب کے لیے برابر کے مواقع میسّر ہوں نہ کہ دولت کی تقسیم بھی برابر برابر ہو "۔

(پیش لفظ کا تیسرا صفحہ ، بارھویں تیرھویں سطر)

صدر ایوب خاں نے انھی خطوط پر اپنے انتخابی منشور میں "اقرار" کیا تھا :

" میرا ایمان ہے کہ تمام طبقاتی امتیازات مٹ جائیں اور اہل پاکستان ایک ایسے مثالی معاشرے کی صورت میں جئیں اور ترقی کریں جو اسلامی اخوت اور انسانی مساوات کی علامت ہو "۔

صدر ایوب کے انھی خیالات نے اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے موجودہ دستور کے سر آغاز میں جگہ پائی تھی جب انھوں نے کہا تھا کہ لوگوں کی مرضی کے مطابق اور قائداعظم کے ارشاد کے بموجب پاکستان ایک ایسی جمہوریہ ہوگا جس کی بنیاد سماجی انصاف کی اسلامی روایت پر ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ سماجی انصاف کی اسلامی روایت یہی ہے کہ خیرالبشر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عمر بھر اتنی رقم نہ ہوئی کہ زکٰوۃ واجب آتی ؛ حضرت صدیق اکبر اپنے طور پر اپنے آپ کو مدینے کے ایک عام مزدور سے زیادہ آمدنی کا استحقاق نہ دیتے تھے ؛ حضرت فاروق اعظم کو گندم کی روٹی کھانے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ انھیں یقین نہ تھا کہ مملکت کے ہر فرد کو گندم کی روٹی مل جاتی ہے اور وہ اس فکر میں گھلتے رہتے تھے کہ فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمر سے اس کا بھی مواخذہ ہو گا۔ اصل بات اتنی ہے کہ مسلمانوں کے یہاں سوشلزم، عمل اور تصور کی حیثیت سے، ہمیشہ قابل قبول رہی ہے لیکن اس دور میں سرمایہ داری نظام کے آڑھتیوں نے اپنی بقاء

کے لیے سوشلزم کے جدید پیروکاروں کی بعض انتہا پسندیوں کو بڑھا چڑھا کر اس کا نام بدنام کر دیا ہے اور مسلمان، سوشلزم کے عمل اور تصور کو قبول کرتے ہوئے بھی، سوشلزم کے لفظ کو ایک دیوار بنا کر بیٹھ گئے ہیں۔

ع اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ‌دار حیلہ گر

جن لوگوں نے اقبال کی شاعری اور افکار کو محض حکومت کی گرانٹ ٹھکانے لگانے والے علمی اداروں کی کارگزاری کی خاطر بسیار نویسی کا حیلہ نہیں بنایا انہیں اقبال کے یہاں اسلامی سوشلزم کے تصور کے وجود کی پوری پوری خبر ہے؛ وہ اقبال کی شاعری میں الارض للہ، فرمان خدا، بلشویک روس، کارل مارکس کی آواز، اشتراکیت، نوائے مزدور، لینن خدا کے حضور میں اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی گرم گفتار نظموں کو نظرانداز نہیں کر سکتے اور نہ اس کے اس طرح کے بیانات سے آنکھ چرا سکتے ہیں کہ اس نے سرفرانسس ینگ ہسبنڈ کو لکھا تھا:
''اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت قریب آ جاتا ہے اس لیے میں متعجب نہ ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس (یعنی اشتراکی معاشرے) کو جذب کر لے یا روس (یعنی اشتراکی معاشرہ) اسلام میں جذب ہو جائے۔''

وہ یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ اقبال نے کارل مارکس کو کلیم بے تجلی، مسیح بے صلیب اور:

ع نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

جیسے القابات سے یاد کیا ہے۔ اقبال کے اس جوش کا سرچشمہ یہ احساس ہے کہ مارکس کی تعلیم نبیؐ کریم کی وحی سے ہمکنار ہوتی تو آج ایک مرتبہ وہ معاشرہ پھر پھول پھل سکتا تھا جو خداوند عالم کے پیش نظر تھا اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک دور میں برپا کر کے دکھایا تھا۔ وہ مارکس اور لینن کا صرف اس لیے اتنا قائل ہے کہ ان کی تعلیم میں اسے مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں سے مٹائی ہوئی صحیح اسلامی و معاشی و معاشرتی تعلیم کی روح نظر آتی ہے؛ فرق ہے تو صرف یہ کہ اشتراکی محض دنیا پر اٹک گئے اور اقبال دنیا کے ساتھ آخرت کو بھی محیط ہونا چاہتا ہے اور یہی اسلامی سوشلزم ہے۔

اسی اسلامی سوشلزم کے لیے قائداعظم تا عمر کوشاں رہے ۔ انھوں نے اپریل ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اعلان کیا تھا : " ہمارے عوام میں کروڑوں افراد ایسے ہیں جنھیں پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا ۔ کیا تہذیب یہی ہے ، کیا پاکستان کا مطلب یہی ہے ؟ آپ کو معلوم ہے کہ کروڑوں انسانوں کو اس طرح سے لوٹ کھسوٹ کا شکار بنایا گیا ہے کہ انھیں ایک وقت کا کھانا تک میسر نہیں آتا ۔ اگر زمیندار اور جاگیردار (اس وقت سرمایہ‌دار طبقے میں صنعت‌کاروں کو موجودہ بے لگام قیادت حاصل نہ ہوئی تھی) عقلمند ہیں تو انھیں اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا ۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خدا ان کے حال پر رحم کرے ، بہر حال ہم ان کی کوئی مدد نہیں کریں گے " ۔

قائداعظم نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ولیکا ٹیکسٹائل مل کا افتتاح کرتے ہوئے یہ تنبیہ بھی کی تھی : " پاکستان میں ذخیرہ‌اندوزوں اور منافع خوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ وہ قوم کے جسم کو مہلک مرض بن کر کھاتے چلے جا رہے ہیں ۔ ان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا ۔ "

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ سرمایہ‌داری نظام مغرب کے اقتصادی اور معاشرتی نظام ہی کا نام ہے ۔ وہ تمام تر جدوجہد جسے اشتراکی انقلاب کہا جاتا ہے اسی استحصال انگیز اور سامراج نواز نظام کے خلاف عمل میں آئی ۔ اگر یہ کہا جائے کہ قائداعظم اسی سرمایہ‌داری نظام میں رہتے ہوئے حالات کی اصلاح چاہتے تھے تو یہ سراسر غلط ہوگا ، قائداعظم نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر ، اپنی وفات سے چند روز پیشتر ہمیں یہ انقلاب آفریں پیغام دیا تھا :

" مغرب کے اقتصادی نظام نے انسانیت کے لیے قریب قریب لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں ۔ ہم میں سے اکثر کو یہ احساس ہے کہ آج اس نظام کے ہاتھوں دنیا کو جس مصیبت کا سامنا ہے اس سے کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا ہے ، یہ نظام انسان اور انسان کے درمیان انصاف قائم کرنے اور بین‌الاقوامی سطح پر رسہ کشی ختم کرنے میں ناکام رہا ہے ، اس کے برعکس دنیا کو پچھلے پچاس سال میں بڑی حد تک اسی نظام کے باعث دو عظیم

جنگوں سے گزرنا پڑا ہے......

" اگر ہمارا منتہائے مقصود یہ ہے کہ اپنے عوام کو خوش حال بنائیں تو مغرب کا اقتصادی نظریہ اور طریق اپنا کر ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا ۔"

مگر سومار صاحب ہمیں یہ سمجھانے نکلے ہیں کہ ہماری مشکلات کا حل مغرب کے سرمایہ داری نظام ہی میں ہے ، ان کا یہ بیان اقبال اور قائداعظم کے انقلاب آفریں فکر و نظر ہی کے منافی نہیں بلکہ صدر ایوب کے فکر و نظر اور پروگرام کے بھی خلاف ہے ۔ یہ تو باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ صدر ایوب نے اقبال اور قائداعظم کی روش سے کنارہ کر کے اور اپنے واشگاف اعلانات کو پس پشت ڈال کر اپنا الحاق سومار صاحب ایسے نو دو لتیے صنعت کاروں سے کر لیا ہے ، جن کی دن دونی اور بے روک ٹوک ترقی ظاہر ہے سرمایہ داری نظام کے تحت ہی ہو سکتی ہے ، اغلب یہ ہے کہ صنعت کاروں کا ذاتی مفاد اب صدر ایوب کے پبلک وعدوں سے ٹکرا رہا ہے ؛ دوسرے لفظوں میں سومار صاحب اس تقریر میں صدر مملکت کو ، صنعت کاروں کی جانب سے للکار رہے ہیں کہ اسلامی سوشلزم کے تصور سے بے تعلقی کا اظہار کر دیں ۔ اور اگر صدر محترم نے سومار صاحب کے اس بیان کو نظر انداز کر دیا تو عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ سرمایہ داری نظام کے نقیب غیر ملکی امداد کے مسئلے ہی میں نہیں ، ملک کی نظریاتی بنیادیں بھی بدلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ۔ اقبال نے قائداعظم کے نام اپنے ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء کے خط میں پاکستان کے لیے جد و جہد کی دعوت دیتے ہوئے اشتراکی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کی تھی اور قائداعظم نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :-

" جب آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو تو آپ نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں " (قائداعظم کی تقاریر مطبوعہ حکومت پاکستان ، صفحہ ۹۸)

اگر سومار صاحب یہ کہیں کہ وہ اصل میں سوشلزم کے خلاف ہیں نہ کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے ، تو ایک طالب علمانہ مطالبہ ہمارا بھی ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام تو لازماً بلا سود بنیادوں پر استوار ہوگا ،

ذرا یہ تو واضح کیا جائے کہ سود کے بغیر جو نظام قائم ہوگا وہ اقتصادی شعبے میں کس طرح سوشلزم سے مختلف ہوگا ؟ آخر ہم کب تک سرمایہ داری نظام کے پروردہ علما کے اس ارشاد کو سنتے رہیں گے کہ اسلام میں سود تو حرام ہے ، لیکن نجی ملکیت پر کوئی قید نہیں ؟ بلا سود نظام تو قائم ہی اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ نجی ملکیت کو غیر محدود نہ رہنے دیا جائے ؛ یہی سوشلزم ہے ، یہی اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیادی اینٹ ہے اور اسلام کے اسی پہلو کو واضح کرنے کے لیے سوشلزم کا اقرار ضروری ٹھہرتا ہے ۔ باقی رہی عقائد کی بات تو اقبال سے لے کر آج تک سوشلزم کے ساتھ اسلام کا ذکر اسی لیے کیا جاتا ہے کہ سوشلزم ضروری تو ہے ، کافی نہیں ۔ کیونکہ ہم دنیا ہی نہیں آخرت میں بھی بھلائی کے متلاشی ہیں ۔

اداریہ

ظلم

روزنامہ حریت کراچی ، ۳۰ جون ۱۹۶۶ء

اسلام کو نقصان اُس کے دشمنوں سے اتنا نہیں پہنچا جتنا اُس کے نادان دوستوں سے پہنچا ہے ۔ قومی اسمبلی میں شاہ عزیزالرحمٰن اور سومار کی جھڑپ سے ہر ذمہ دار آدمی کے دل کو دکھ پہنچا ہے ۔ یہ بات آخر کیوں کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اسلام خوذ اپنی ایک مخصوص فکر رکھتا ہے ۔ اس کا نظام حکومت ، نظام اجتماع اور نظام معیشت الگ ہے ۔ یہ کیا بے خبری ہے کہ کوئی اسلام کو کیپٹلزم قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی سوشلزم ۔

قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی آخری تقریر میں ”یہ کہاتھا کہ یورپ میں نظام سرمایہ‌داری نے دو ہولناک جنگیں برپا کروائیں ، ہمیں اس سے بچنا ہے ۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس اپنا نظام معیشت موجود ہے ۔ ہمیں اسی کو نافذ کرنا ہے ، یوں ایک صاحب ِ پیغام قوم کی حیثیت سے ہم صرف اپنی ہی نہیں ، ساری انسانیت کی خدمت کریں گے ۔“

اسلام یقیناً کیپٹلزم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ۔ اس نے بار بار اس پر لعنت بھیجی ہے ۔ ” جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرکے

رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو ۔ جہنم کی آگ میں ان خزانوں کو تپایا جائے گا اور پھر ان سے ان کی پیشانیاں اور پہلو ، اور پیٹھیں داغی جائیں گی (کہ) یہی تو ہے جو تم اپنے لیے جمع کرکے رکھا کرتے تھے ۔ لو اب اپنے خزانوں کا چکھو مزا ۔ '' سورۂ توبہ کی اس آیت سے بڑی وعید اور کیا ہوگی ۔ عہد حاضر کا وہ نظام جسے سوشلزم کہا جاتا ہے وہ اسی کیپٹلزم کا فطری رد عمل ہے ۔

کیپٹلزم میں انفرادی ملکیت کا حق ہے ۔ جو شخص جتنی چاہے ملکیت رکھے ، اور جتنا چاہے فائدہ اٹھائے ۔ ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ معاشرے کو اشیائے مطلوبہ فراہم کرے ؛ اس کی قیمت اور منافع وصول کرے ۔ اس میں ہر چیز کی قیمت ، طلب و رسد کے اصول پر متعین کی جاتی ہے ۔ اس نظام کی خرابی یہ ہے کہ اس میں حکومت پر سرمایہ دار چھا جاتے ہیں ۔ اخبارات کو ، ادارات کو ، سیاسی جماعتوں کو اور کارکنوں کو سرمایہ دار خرید لیتے ہیں ۔ ووٹ تک بک جاتے ہیں اور بالآخر حکومت عوام کی فلاح و بہبود کی کوئی اسکیم چلانے کے قابل نہیں رہتی ۔ سارے کام ایک خاص گروہ کی مرضی کے تابع اور اسی کے فائدے کے لیے مخصوص ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

سوشلزم میں اجتماعی ملکیت کا تصور ہے کہ جو کچھ ہے وہ معاشرے کا ہے ۔ تاہم انفرادی ملکیت کا حق بالکل ختم نہیں کیا گیا ۔ اسے سختی سے محدود کر دیا گیا ہے ۔ اشیائے ضرورت ، گھر ، فرنیچر ، سواری ، لباس وغیرہ اجتماعی ملکیت سے مستثنیٰ ہیں ۔ لیکن زمین ، مشینری ، کارخانے انفرادی ملکیت نہیں بن سکتے ۔ اسی طرح داخلی اور خارجی تجارت اور بینک وغیرہ بھی سب اسٹیٹ کی ملکیت ہوتے ہیں ۔ اس نظام میں کام منصوبہ بندی سے ہوتا ہے ۔ جس چیز کی جتنی ضرورت معاشرے کو ہو اتنی ہی پیدا کی جاتی ہے ۔ قیمتوں کے تعین ، قوت خرید میں کمی بیشی ، اور اجتماعی آمدنی کی تقسیم کا اختیار اسٹیٹ کو حاصل ہوتا ہے ۔ اس نظام سے تجارتی چکر ، سٹہ بازی اور ذخیرہ اندوزی کی بلائیں ختم ہو جاتی ہیں اور بے روزگاری کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ اس نظام کی خرابی یہ ہے کہ شخصی آزادی ، آزادیٔ فکر و عمل ، آزادیٔ تنظیم

اور آزادیٔ صحافت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسٹیٹ قوی تر ہو کر رب الارباب بن جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو خرابی خود کپٹلزم میں ہے اس کا ظہور اس کے رد عمل میں بھی ہونا تھا۔ اسلام نے جو راہ دکھائی ہے وہ توازن و اعتدال کی ہے، اور انسانیت کی ہے۔ انفرادی ملکیت کے ایک پہلو کو اسلام اور کیپٹلزم میں بظاہر مشترک پا کر کوئی شخص اگر اسلام کو کپٹلزم تصور کر سکتا ہے تو کاروباری چکر، سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی، سودی لین دین اور استحصال کے تمام ذرائع کی مخالفت، اسلام اور سوشلزم میں مشترک پا کر کوئی اسلام کو سوشلزم کیوں تصور نہ کرے۔

یہ بڑا ظلم ہے اسلام پر کہ لوگ اس طرح اسلام کو اپنی فکر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام ہرگز اس کا حامی نہیں ہے کہ دولت اور اسبابِ دولت کسی ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھوں میں چلے جائیں۔ وہ معاشی و فکری اور سیاسی و اخلاقی دستبُرد کے تمام ذرائع کا خاتمہ چاہتا ہے۔ خدا کے لیے اسلام کا ایمان داری کے ساتھ مطالعہ کرو۔

خط

اسلامی سوشلزم کا مسئلہ

روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷ جولائی ۶۶ء

مکرمی! نوائے وقت (۲۹ جون) میں عبداللہ حُر صاحب کا مضمون "کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے" پڑھا۔ اس میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک اسلام صرف آخرت ہی کی بھلائی کے لیے ہے اور دنیا کی بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ سوشلزم کا اقرار کیا جائے اور اسلام اور سوشلزم کا مرکب استعمال کیا جائے۔ عبداللہ حُر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اسلام نہ صرف اقتصادی نظام کی حیثیت سے بلکہ ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے نافذ رہ چکا ہے اور بحیثیت ایک مکمل نظام حیات کے یہ کسی اور نظام کی خوشہ چینی کا محتاج نہیں ہے۔ غالباً وہ اسلامی سوشلزم کی مخالفت پر آپے سے باہر ہو گئے چنانچہ انھوں نے سومار صاحب کے ساتھ ساتھ علماء کو بھی "سرمایہ داری نظام کے پروردہ" قرار دیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ عبداللہ حُر صاحب " اشتراکی نظام کے پروردہ "

ہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ انہیں ایک علمی بحث میں متانت اور حوصلہ مندی سے کام لینا چاہیے تھا ۔ (**عبدالرشید عاجز** ۹۰ ۔ اے گڑھی شاہو ، لاہور) ۔

خبر

اسلامی سوشلزم کے وجود سے انکار کرنے والوں کا نظریہ غیر حقیقت پسندانہ اور بے بنیاد ہے

کراچی روٹری کلب کے سالانہ ڈنر پر سٹیٹ بنک کے گورنر مسٹر ایس اے حسنی کی تقریر

روزنامہ نوائے وقت لاہور ، ۷ جولائی ۹۶۶

کراچی ، ٦ جولائی، (پ‌پ‌ا/اپ‌پ)۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر مسٹر ایس ۔ اے حسنی نے بعض افراد کے اس نظریے کو سراسر بے بنیاد اور غیر حقیقت پسندانہ قرار دیا ہے کہ اسلامی سوشلزم کا کوئی وجود ہی نہیں۔ آپ نے منگل کی رات روٹری کلب کے سالانہ ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے اسلامی سوشلزم کے وجود سے انکار کرنے والوں پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ ایسے لوگ یکسر سرمایہ دارانہ ذہنیت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور اسلامی تصورات کو گوارا تک کرنے کے روادار نہیں ہیں ۔ آپ نے اس ضمن میں صدر مملکت کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جو انھوں نے پاکستان کے تیسرے پنجسالہ ترقیاتی منصوبے کے مقدمے میں استعمال کیے تھے. اور جن میں صدر نے کہا تھا ” اقتصادی اور معاشرتی شعبوں میں ہماری تمام تر کوششوں کا منتہائے مقصد صرف یہ ہے کہ ہم جلد سے جلد پاکستان میں اسلامی سوشلزم قائم کر سکیں ۔ اس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ ہم اقتصادی ترقی کی دوڑ میں اپنے اس قیمتی ثقافتی اور مذہبی ورثے سے محروم نہ ہو جائیں جو دین متین اسلام سے ہمارے حصے میں آیا ہے ۔ “

مسٹر حسنی نے کہا کہ اسلامی سوشلزم سے انکار کرنا بہت بڑی زیادتی ہے اور جن لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ اسلامی سوشلزم کا کوئی وجود نہیں وہ خود بھٹکے ہوئے ہیں اور اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ سے ناواقف ہیں ۔ آپ نے مثالوں سے واضح کیا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے کس طرح کسی غیر ملکی مالی امداد کے بغیر اپنی اجتماعی کوششوں سے

اقتصادی ترقی کی تھی اور خالصاً اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر عظمت حاصل کی تھی۔ مسٹر حسنی نے کہا کہ دو متضاد اور انتہا پسندانہ نظریوں یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلے میں اگر متوازن معاشیات کے لیے صحیح حل ملتا ہے تو وہ صرف اسلامی سوشلزم ہی میں ملتا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ اسلامی سوشلزم میں انفرادی ملکیت ممنوع نہیں بشرطیکہ اس سے ارتکاز دولت پیدا نہ ہونے پائے۔ آپ نے دولت چند افراد تک محدود ہو جانے کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ اس ارتکاز دولت کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں اس لیے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ مساویانہ ہونی چاہیے اور ہر ایک کو خوشحال بننے کے مساویانہ مواقع حاصل ہونے چاہییں

خط

اسلامی سوشلزم

روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۹ جولائی ۱۹۶۶ء

مکرمی! نوائے وقت میں عبداللہ حُر صاحب کے مضمون "کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے" کے بعد سٹیٹ بنک کے گورنر ایس اے حسنی صاحب کی تقریر نظر سے گزری۔ انھوں نے بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت پر بھرپور وار کیا ہے لیکن ایک بات کو دونوں اصحاب نظر انداز کر گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سرمایہ دار یہ تو چاہتا ہے کہ سرمایہ کھُل کھیلنے کے لیے آزاد ہو لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جس نظام کا سہارا لے کر وہ سرمایے پر پابندی کو ناجائز سمجھتا ہے اس نظام کے تحت اور بہت سی باتوں پر بھی پابندی ناجائز ٹھہرتی ہے۔ چونکہ اسلامی سوشلزم پر اعتراض سومار صاحب نے کیا تھا اور اس کے مقابلے میں سرمایہ داری نظام کی وکالت کی تھی اور وہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین ہیں اس لیے ان پر اس سوال کا جواب دینا واجب آتا ہے کہ کیا سرمایہ داری نظام میں سرمایہ تو آزاد ہوتا ہے لیکن پریس پر پابندی لگا دی جاتی ہے؟ اس وقت جن ملکوں میں سرمایہ داری نظام رائج ہے ان میں سرِ فہرست امریکہ اور برطانیہ ہیں۔ کیا ان ملکوں کا پریس بھی اسی طرح

پابند ہے جس طرح نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات ہیں اور کیا وہاں بھی اخباروں کے ایڈیٹروں کو اسی طرح معطل کیا جاتا ہے اور پریسوں پر اسی طرح تالے ڈالے جاتے ہیں - (نظر علی شاہ ، ۲۵۰ شاد باغ ، لاہور)

مضمون

اسلامی سوشلزم

بہ سلسلہ ”کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے ؟“

روزنامہ نوائے وقت لاہور ، ۹ جولائی ۶۶ء

ایم - ایچ - حکیم ، گجرات

” نوائے وقت “ (۲۹ جون) میں ایک مضمون ”کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے “ شائع ہوا ہے - اس مضمون میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین اور رکن قومی اسمبلی اے کے سومار صاحب کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے کہ انھوں نے قومی اسمبلی کے ۲۴ جون کے اجلاس میں یہ کہا کہ اسلامی سوشلزم ایک بہت بڑا فراڈ ہے - سومار صاحب کی طرف منسوب کیے گئے الفاظ میری نظر سے نہیں گزرے کیونکہ میں قومی اسمبلی کی کارروائی کی رپورٹیں جو انگریزی اخبارات میں چھپتی ہیں نہیں پڑھا کرتا - بہر حال میرا تعلق نہ سومار صاحب سے ہے نہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے کسی اخبار سے ، میں حکومت کا ملازم نہیں ہوں ، میرا نہ حزب اقتدار سے کوئی تعلق ہے نہ حزب اختلاف کی کسی جماعت سے - عبداللہ حُر صاحب کے مضمون کے جواب میں میری طرف سے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ایک عام شہری کی حیثیت سے لکھا جا رہا ہے ، اور میرے سامنے یہاں صرف یہ سوال ہے کہ اسلامی سوشلزم کی نظریاتی اور واقعاتی حیثیت کیا ہے - عبداللہ حُر صاحب نے اسلام کے ابتدائی زمانے کی کچھ باتیں بتائی ہیں اور قائداعظم ، علامہ اقبال اور صدر ایوب کے چند اقوال لکھے ہیں اور انھیں اسلام میں سوشلزم کی موجودگی کے ثبوت میں پیش کیا ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محض ان باتوں اور اقوال سے اسلامی معاشرے میں ، پہلے کسی درمیانی زمانے میں یا اب ، سوشلزم کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے ؟

پہلا سوال یہ ہے کہ سوشلزم سے مراد کیا ہے ؟ دوسری متعلق یا غیر متعلق چیزوں کو چھوڑ کر ایک چیز جو سوشلزم کے تمام نظریوں

میں پائی جاتی ہے اور ان کا مابہ‌الامتیاز ہے وہ دولت کی مساوی تقسیم کا نظریہ ہے ۔ اسلام کی ساری تاریخ پر نظر دوڑائیے ، کیا آپ کو کسی زمانے میں بھی دولت کی مساوی تقسیم موجود نظر آئے گی ؟ کیا رسول کریم کے اسوۂ حسنہ پر آپ کی زندگی میں مسلمانوں نے عمل کیا یا آپ کی حکومت نے معاشرے کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ امراء اور غرباء کے درمیان اقتصادی عدم مساوات ختم ہو گئی ؛ خلیفۂ اول کو زکٰوۃ دینے سے انکار کرنے والوں کے خلاف جنگ لڑنی پڑی لیکن اس کا عملی نتیجہ بدوؤں میں بددلی پیدا کرنے کے سوائے اور کچھ نہ ہؤا ۔ خلیفۂ دوم نے ملک عرب میں فتوحات کے ذریعے باہر سے آئی ہوئی دولت کو لوگوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا جو اسلام کی ساری تاریخ میں اپنی نوع کا ایک بے نظیر واقعہ ہے لیکن اسے تقسیم کرتے وقت جو قواعد بنائے گئے ان میں یہ قاعدہ موجود نہ تھا کہ ہر ایک فرد کو ہر دوسرے فرد کے برابر حصہ دیا جائے — ملک کی آبادی کو چند جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن سب جماعتیں برابر کی حقدار نہ قرار دی گئیں بلکہ بعض ترجیحات کو پیش نظر رکھ کر انھیں ترتیب دی گئی ۔ خلیفۂ سوم اپنی مخصوص معاشی حالت کی وجہ سے غرباء کے ساتھ ہمدردی کے جذبے سے کیسے آشنا ہو سکتے تھے ۔ خلیفۂ چہارم کو ملک میں خلفشار شروع ہو جانے سے اس معاملے کی طرف توجہ ہی کی فرصت نہ ملی ۔ ان خلفا کے بعد ملوکیت کا دور دورہ شروع ہو گیا جس میں عوام کالانعام کو کسی شمار قطار میں نہ سمجھا گیا ۔ یہ ہے اسلام کی ساری لمبی تاریخ میں دولت کی مساوی تقسیم کی داستان کا لب لباب ۔

اسلام کی دنیا میں آج تک اس بارے میں جو کچھ ہؤا اس سے واقف ہو جانے کے بعد آئیے اب یہ دیکھیں کہ اسلام نے بطور دین اس بارے میں کیا احکام یا ہدایات دی ہیں ۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو دنیا اور انسانوں کا خالق ہے ہمارا رازق بھی وہی ہے ، وہ کسی کو کم دیتا ہے کسی کو زیادہ ، جسے زیادہ دیا گیا ہے اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہو ، جسے کم ملا ہے اسے راضی برضا رہ کر صبر سے کام لینا چاہیے اور جنھیں زیادہ دیا گیا ہے ان کے خلاف حسد کا جذبہ اپنے دل میں نہیں رکھنا چاہیے ۔ ایک دوسرا خیال جو اس سے ذرا مختلف ہے لیکن مساوی تقسیم کے بارے میں مختلف نہیں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان معنوں

میں رزاق ہے کہ اس نے کرۂ ارض پر رہنے والے انسانوں کے لیے بے حد و حساب رزق پیدا کر رکھا ہے لیکن اس کی تقسیم وہ خود نہیں کرتا ؛ اس نے یہ قاعدہ بنا رکھا ہے کہ جتنی محنت کی جائے اسی کے مطابق رزق ملے گا : فلیس للانسان الاماسعٰی ۔ اگر یہ درست ہے تو کسی فرد کی طرف سے رزق کی کمی کی شکایت بے جا ہوگی اور دولت کی مساوی تقسیم کا مطالبہ بے جواز ۔ قرآن مجید میں دولت حاصل کرنے ، اسے جمع رکھنے ، اسے فضول خرچیوں میں اڑانے ، اس کے استعمال میں بخل کرنے ، اس کی مدد سے انعامات کو ظلم میں بدلنے ، اسے عوام کی بہبودی کے لیے کھلے ہاتھوں خرچ کرنے وغیرہ وغیرہ کی نسبت بہت کچھ آیا ہے لیکن یہ ساری باتیں ہدایت اور ترغیب کی شکل میں ہیں—سوائے ان تین مدوں کے (۱) زکٰوۃ کا تاکیدی حکم جس کی شرح رسول ِ کریمؐ نے اڑھائی فیصد مقرر کر دی (۲) مرنے والے کی جائیداد کی اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم کا حکم تاکہ اس کی ساری کی ساری جائیداد پر اس کا سب سے بڑا بیٹا قبضہ نہ جما لے اور (۳) سود لینے کی تاکیدی ممانعت ۔کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر ایک اسلامی حکومت ان تینوں احکام پر پوری طرح عمل کرائے تو دولت کی مساوی تقسیم ایک حد تک وجود میں آ سکتی ہے لیکن اس کے برعکس دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ ان احکام کی ہمہ وقت موجودگی کے باوجود مسلمان ملکوں میں دولت نہ کبھی مساویانہ طور پر تقسیم ہوئی ہے اور نہ آئندہ ایسا ہونے کا امکان نظر آتا ہے ۔ اسلام میں نجی ملکیت پر نہ کوئی قید ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حد مقرر کی گئی ہے ۔ اگر ایک فرد اپنی دولت پر زکٰوۃ دیتا رہے تو اس کے پاس اگر کوہ احد کے برابر بھی سونا جمع ہو جائے تو اسلامی حکومت اسے چھو تک نہیں سکتی—یہ قول پاکستان کے ایک ممتاز عالم ِ دین سے منسوب کیا جاتا ہے ۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں سوشلزم کی نظریاتی اور واقعاتی حقیقت کیا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ''لااکراہ‌فی‌الدین'' کا نظریہ ہمہ گیر ہے- جس‌طرح کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں کیا جا سکتا اور کسی مسلمان کو جبراً مسلمان نہیں رکھا جا سکتا اسی طرح کسی اسلامی معاشرے میں دولت کی مساوی تقسیم جبراً بروئے کار نہیں لائی جا سکتی ۔

خط

اسلامی سوشلزم

روزنامہ نوائے وقت ، لاہور ، ۱۰ جولائی ۱۹۶۶ء

مکرمی ! نوائے وقت (۷ جولائی) میں عبدالرشید عاجز صاحب کا ایک خط ”اسلامی سوشلزم کا مسئلہ“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے عبداللہ حُر صاحب کے مضمون ”کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے ...“ پر چند اعتراضات کیے ہیں ۔ عبداللہ حُر صاحب کے مضمون سے یہ مطلب نکالنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے کہ اسلام صرف آخرت کی بھلائی کے لیے ہے اور دنیا کی بھلائی اسلام کے بس کا روگ نہیں۔ جس ضرورت کے تحت عبداللہ حُر صاحب نے اسلام کے ساتھ دنیاوی مسائل حل کرنے کے لیے سوشلزم کا ذکر ضروری خیال کیا ہے اسی کے پیش نظر علامہ اقبال ، قائداعظم اور صدر ایوب نے اسلامی سوشلزم کا واضح الفاظ میں اپنے بیانات اور افکار میں ذکر کیا ہے ۔ اتفاق سے ۷ جولائی ہی کے اخبارات میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر مسٹر ایس اے حسنی کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے اسلامی سوشلزم کے وجود سے انکار کرنے والوں کے نظریے کو غیر حقیقت پسندانہ اور بے بنیاد قرار دیا ہے اور صدر ایوب کے ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے تیسرے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کے پیش لفظ میں لکھے تھے۔ بے شک اسلام دور حاضر کے تمام مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے لیکن اسلام کے ساتھ آج کے دور میں سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرنا اس لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مہروں نے اسلام کی شکل مسخ کر دی ہے اور اس اسلام پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے جو نبی کریم ؐ، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عمر فاروق رضؓ، اور حضرت عمر رضؓ بن عبدالعزیز کے دور میں کارفرما تھا ۔ یقیناً اُس دور میں جو اسلام نافذ تھا اس کو آج کے سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظاموں سے کوئی تعلق نہ تھا اور دولت کی تقسیم کے اعتبار سے آج کے مثالی سوشلسٹ معاشرے میں اس مبارک دور کی کچھ نہ کچھ جھلک ملتی ہے ۔ جن لوگوں کو اسلامی سوشلزم پر اعتراض ہے انہیں اسلام کے اولین دور پر اعتراض کرنے کی جرأت کرنی چاہیے اورساتھ ہی اپنے عظیم قومی راہنماؤں اقبال، اور قائداعظم کے ارشادات کو بھی غلط قرار دینا چاہیے۔ (**راشد چودھری**، کفشن کالونی، لاہور)

اداریہ

اسلامی سوشلزم

روزنامہ کوھستان لاہور، ۱۰ جولائی ۶۶ء

سٹیٹ بنک کے گورنر مسٹر ایس اے حسنی نے کراچی میں روٹری کلب کے ایک عشائیے میں تقریر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پاکستان کی اقتصادی پالیسی کی تشکیل کے لیے سب سے موزوں اساس اسلام کا اقتصادی نظام پیش کرتا ہے کیونکہ ''اسلامی سوشلزم'' اور رفاہی مملکت کے تصور میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ اسلامی سوشلزم اقتصادی ترقی کی دھن میں ملک کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کو ملیامیٹ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دولت کی مساوی تقسیم پر قوتیں ضائع کرنے کے بجائے زندگی کی دوڑ میں ہر شخص کو یکساں ترقی کے مواقع مہیا کرنے پر زور دیا جائے۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ پاکستان کی صحت مند اور متوازن اقتصادی منصوبہ بندی صرف اسلامی تصورِ معیشت و اقتصاد کی بنیاد پر ہی ممکن ہے اس سے انکار کی جرأت تو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یا تو اسلام کے اقتصادی نظام سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے اور چند سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر یہ فتویٰ دے دیا کرتے ہیں کہ اسلام آج کے اقتصادی مسائل کا کوئی حل ہی پیش نہیں کرتا اس لیے ملکی معیشت کی بنیادیں اسلامی تعلیمات کی اساس پر استوار ہی نہیں ہو سکتیں ؛ یا پھر اسلامی نظام معیشت پر وہ گروہ اعتراضات اٹھاتا ہے جو معیشت کے ایک خاص تصور کو بنیاد بنا کر دنیا کے مختلف اقتصادی نظاموں پر تنقید اور تنقیص کرتا ہے ۔

لیکن ہمیں حیرت اس وقت ہوتی ہے جب بعض سنجیدہ اور اہل فکر حضرات بھی اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں کچھ اس طرح اظہارِ خیال کرنے لگتے ہیں کہ جیسے اسلام اور سوشلزم دونوں ہم معنی اور مترادف نظام ہیں اور ان کے درمیان اگر کوئی فرق ہے بھی تو صرف اتنا کہ اسلام کا نظام معیشت ثقافتی اور مذہبی اقدار کو قائم رکھتے ہوئے اقتصادی ترقی کا قائل ہے جب کہ سوشلزم ان اقدار کو اپنی راہ میں رکاوٹ تصور کرتا ہے ۔ جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے اس کی ابھی تک

کوئی ایسی جامع و مانع تعریف اور کوئی ایسا متفق علیہ ، تصور پیش نہیں کیا گیا جس کو بنیاد بنا کر اس نظامِ معیشت کا تجزیہ کیا جا سکے - مختلف سوشلسٹ ملکوں میں اس کی مختلف تعبیریں کی جا رہی ہیں اور انھی کی بنیاد پر مختلف قسم کے سوشلسٹ نظام قائم ہو رہے ہیں - روس بھی سوشلسٹ ریاست ہے اور یوگوسلاویہ بھی اور الجزائر، شام اور عرب جمہوریہ بھی اپنے اپنے یہاں سوشلزم ہی کا تجربہ کرنے میں مصروف ہیں - پھر اسی سوشلزم کے کچھ روپ برطانیہ ، سویڈن ، کیوبا اور بھارت میں بھی پیش کیے جا رہے ہیں ، اور ان کے درمیان کوئی قدر مشترک تلاش کرنا بجائے خود ایک ریسرچ کا موضوع ہے -

اسلام اس کے برعکس ایک بالکل واضح ، دو ٹوک اور متعین نظام حیات ہے جس کے مآخذ خدا کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہیں۔ اس کے لازوال اصول انسانی ذہن کی تخلیق نہیں، وحی الٰہی کے ذریعے طے کر دیے گئے ہیں جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں اور ان کی تعبیر و تشریح بھی اسوۂ نبوی نے اس طرح کر دی ہے کہ ہر دور میں اور مختلف حالات میں اس سے رہنمائی ملتی ہے اور ترک و اختیار کی راہیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں -

اسلام کے جامع نظام حیات کا ایک شعبہ اس کا نظام معیشت ہے اور اسے اس مکمل نظام زندگی کے ایک جزو کی حیثیت سے ہی زیر بحث لانا درست ہو سکتا ہے -

اسلامی نظام حیات کی پوری عمارت خدا و رسول پر ایمان کامل اور آخرت کی جواب دہی کے تصور پر قائم ہے - جہاں دنیا کی اس زندگی کو ایک آزمائش اور امتحان قرار دیا گیا ہے وہاں انسانی سعی و جہد کی منزل مادی ترقی اور خوشحالی نہیں ، زندگی کے امتحان میں کامیابی اور خالقِ کائنات کی رضا کا حصول ہے - ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر زندگی کا جو نظام استوار کیا جائے گا اس کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں یہی روح کارفرما ہوگی اور اس کے کسی شعبے میں بتائے ہوئے کچھ اصولوں کو کسی دوسری جگہ اس روح سے محروم کرکے اگر نافذ بھی کیا جائے گا تو اس سے خاطر خواہ نتائج کی توقع عبث ہوگی - اس تصور کے ساتھ زندگی کے کسی اور تصور کا کوئی پیوند لگنا ممکن ہی نہیں اور اسلامی سوشلزم ، اسلامی آمریت

کی راہ ہموار کرنے اور پاکستان کو ایک نظریاتی فلاحی مملکت بنانے کے لیے معاشرتی بہبود کی اہمیت بیان کی۔

خط

اسلامی سوشلزم

روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۷ جولائی ۶۶ء

مکرمی! نوائے وقت (۹ جولائی) میں ایم ایچ حکیم صاحب کا مضمون بسلسلہ ''کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے'' پڑھا۔ موصوف نے اقبال، قائداعظم اور محترم صدر ایوب کے واضح بیانات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ سوشلزم یعنی معاشی مساوات کا اسلام میں کبھی وجود نہیں رہا اور نہ ہی دین اسلام کے قوانین میں کسی ایسی ترمیم کی گنجائش ہے کہ معاشی مساوات قائم ہو سکے۔ میرے خیال میں موصوف نے تاریخ اسلام میں غور نہیں کیا ورنہ یہ بات واضح ہے کہ دین اسلام میں وقتاً فوقتاً عوامی بہبود کے لیے قوانین میں ترمیم ہوتی رہی ہے مثلاً اسلام نے غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کے لیے کوئی تنبیہ نہیں کی کیونکہ اس وقت کے ماحول میں یہ بات چنداں قابل اعتراض نہ تھی لیکن آج کسی بھی اسلامی مملکت میں غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری نہیں ہے۔ رسول مقبول اور خلفائے راشدین نے خود کو معاشی طور پر کسی ادنیٰ درجہ کے غریب مسلمان سے بھی زیادہ خوشحال نہ رکھا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بحیثیت سر براہ مملکت ہزاروں درہم ماہانہ بطور تنخواہ وصول کر سکتے تھے اور نجی جائدادیں بنا سکتے تھے۔ خلفائے راشدین دن رات غریبوں کی امداد و بہبود میں لگے رہتے تھے۔ موجودہ دور کا تقاضا ہے بنکوں، بیمہ کمپنیوں اور بڑے بڑے کارخانوں کو قومی ملکیت قرار دے دیا جائے۔ (احسان علی، چوک بہارشاہ، شیخوپورہ)

مضمون

اسلام اور سوشلزم

بہ سلسلہ ''کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے ؟''

اکبر علی ، گجرات

روزنامہ نوائے وقت لاہور ، ۲۰ جولائی ۶۶ء

نوائے وقت (۲۹ جون) میں ایک مضمون '' کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے '' شائع ہؤا ہے جس میں عبداللہ حُر صاحب نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین اور رکن قومی اسمبلی اے کے سومار صاحب کے قومی اسمبلی میں بیان کو ہدف تنقید بنایا ہے ۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد نوائے وقت ۲۲ جولائی میں ایم ایچ حکیم صاحب گجرات کی عبداللہ حُر صاحب کے مضمون پر تنقید پڑھی جس میں انھوں نے پوری کوشش سے ثابت کیا ہے کہ اسلام واقعاتی اور نظریاتی طور پر سوشلزم کے خلاف ہے ۔ ایم ایچ حکیم صاحب نے اسلامی سوشلزم کی جو واقعاتی اور نظریاتی تصویر پیش کی ہے اس پر پوری بصیرت سے روشنی نہیں ڈالی گئی۔ ان کا لکھا ہؤا مضمون پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کی سوشلزم سے مراد مال غنیمت کی مساوی تقسیم ہے جو سوشلزم کے منطقی استدلال کے منافی ہے ۔ دولت کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز نہیں ہے جسے افراد میں برابر برابر تقسیم کر دینے سے سوشلزم کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جاتا ہے بلکہ دولت پیدا کرنے کے کچھ ذرائع ہوتے ہیں جن پر انسانی محنت صرف کر کے دولت پیدا کی جاتی ہے ۔ انھی ذرائع کو استعمال کر کے انسان کسب معاش کرتا ہے ۔ اب سوشلزم سے مراد ان ذرائع معاش پر ہر ایک کا مساوی حق تسلیم کرنا ہے تاکہ کسبِ معاش کی سہولتیں ہر ایک کو یکساں میسر ہوں ۔ اب اگر ان ذرائع معاش پر کوئی ذاتی استعداد کی بنا پر زیادہ محنت کر کے زیادہ معاوضہ حاصل کر لے تو یہ بات ہرگز سوشلزم کے خلاف نہیں جاتی ۔ اس سلسلے میں ایک بات جو مستقل طور پر ذہن نشین رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ان ذرائع معاش میں دوسروں کی محنت سے ناجائز استفادہ نہ کیا جائے جو سوشلزم کے خلاف سرمایہ پرستی کا بنیادی اصول ہے ۔ اب اس اصول کی روشنی میں خدائے تعالیٰ کے فرمان جس کی مثل

حکیم صاحب نے پیش کی ہے کہ ''جتنی محنت کی جائے گی اس کے مطابق رزق ملے گا (لیس للانسان الاماسعی) کا مفہوم سمجھا جائے تو سوشلزم کو بھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔

اپنے مضمون میں حکیم صاحب نے اسلام میں جو عدم سوشلزم کا واقعاتی پس منظر پیش کیا ہے وہ بھی مبنی برحقائق نہیں ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کی ساری تاریخ میں دولت کی مساوی تقسیم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کیا اس استدلال کے خلاف یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ حضور نبی کریم یا ابوبکر صدیق یا فاروقِ اعظم نے اقتدار یا ثروت میں کون کونسی اجارہ داریاں پیدا کیں یا ان کا جواز مہیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے تو مصر کے ایک گورنر کو سزا محض اس لیے دی کہ اس کا لباس عوام کے لباس کے مساوی نہ تھا۔ چلیے اس بات کو بھی چھوڑیے، اگر دور ما سبق کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو پتا لگتا ہے کہ اس زمانے میں کسبِ معاش کے ذرائع ذاتی محنت پر منحصر تھے جس سے ارتکازِ زر کے امکان نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسلام کا ابتدائی دور مشینی دور نہ تھا۔ زر اندوزی نے تو خطرناک صورت اس وقت اختیار کی جب انسان اور سرمایے کے درمیان مشینوں کا واسطہ پیدا ہو گیا۔ مشینی دور میں سرمایہ دار کی قوت میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے ذرائع معاش پر قبضہ کر کے ان کی محنت کوڑیوں کے بھاؤ خریدنے کے قابل ہو گیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد امارت اور افلاس میں خلیج گہری تر ہوتی گئی۔ اس دور میں عوام سے معاشرتی قرب ختم ہونے لگا اور سوشلزم کے تقاضوں کی اہمیت بڑھنے لگی۔ اس دور میں زر آفرینی اور افلاس میں معکوس تناسب پیدا ہو گیا۔ یعنی جوں جوں ایک زر اندوز کا دامن بھاری ہوتا گیا وہ زیادہ سے زیادہ عوام کے ذرائع معاش پر محیط ہو کر انہیں محتاج بنانے کے قابل ہو گیا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے وقت دنیائے اسلام میں ملوکیت کا دور نافذ ہو چکا تھا جس کا جواز اسلامی احکامات و ہدایات میں نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھنا مقصود ہے کہ اس مشینوں کے دور میں جو اسلام کے بعد کی پیداوار ہے اسلامی احکامات وہدایات کے مطابق سوشلزم کے کیا امکان ہیں۔ اسلامی نظریات میں یہ گتھی بطریق احسن سلجھی ہوئی موجود ہے۔ اسلام نے سود لینے کی تاکیدی ممانعت کی ہوئی ہے۔ آئیے اب دیکھیں

کہ سود کیا ہے ۔ اسلامی نظریات کے مطابق سُود خور وہ ہے جو کسی منافع کے لالچ پر کسی آدمی کی مدد کرتا ہے ۔ اگر کوئی آدمی کسی کو سو روپے دے کر دس یا بیس روپے لیتا ہے تو سوؔ سے زائد رقم دس یا بیس روپے امداد لینے والے کی اس محنت کا حاصل ہے جو ساہوکار چپکے سے جیب میں ڈال لیتا ہے ۔ یعنی اسلام کے نزدیک صاف لفظوں میں سود سے مراد دوسروں کی محنت سے منافع یا دوسروں کی محنت پر ناحق تصرف ہے ۔ اب اگر یہ بات صحیح ہے تو اسلام سے بڑھ کر سوشلزم کا داعی اور کوئی نظام نہیں ہو سکتا ۔ اب غور کریں کہ سرمایہ دار کا منافع کس کی محنت کا حاصل ہے ؟ ظاہر ہے کہ مزدوروں کی محنت کا ! معاشرتی انصاف کا تقاضا ہے کہ مزدوروں کی محنت کا حاصل مزدوروں میں تقسیم ہونا چاہیے نہ کہ سارے کا سارا فرد واحد کو ملنا چاہیے جو ان کے ذرائع معاش پر محیط ہے ۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق سب ذرائع معاش قومی ملکیت ہیں اور ان سے پوری قوم کو مستفید ہونا چاہیے ۔ اسلامی نظریات کے مطابق سودی سرمایہ کاری ختم ہونے سے نجی ملکیت خودبخود محدود ہو جاتی ہے ۔ وہی سرمایہ قومی کہلا سکتا ہے جس میں پوری قوم حصہ‌دار ہے ، نہ کہ وہ جس پر چند افراد قابض ہوں ۔ ذاتی محنت سے جائز طور پر جتنا کوئی کما لے اس سے دوسروں کے مفاد پر زد نہیں پڑتی اور نہ ہی اس سے دوسروں کا عرصۂ حیات تنگ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے اجارہ داریاں ابھر سکتی ہیں ۔ اب سوال رہ جاتا ہے جبراً دولت کی مساوی تقسیم کا ۔ حکیم صاحب نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جس طرح اسلام میں کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جا سکتا اور کسی مسلمان کو جبراً مسلمان نہیں رکھا جا سکتا اسی طرح اسلامی معاشرے میں دولت کی مساوی تقسیم جبراً بروئے کار نہیں لائی جا سکتی تو اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر حضرت ابوبکر صدیق جبراً زکٰوۃ وصول کر سکتے ہیں تو ایک اسلامی حکومت سودی سرمایہ کاری کا دھندا جبراً ختم کر کے دولت کی مساوی تقسیم کے لیے سازگار فضا پیدا کر سکتی ہے ۔

مضمون

اسلام میں مساوات

بہ سلسلہ ”کیا اسلامی سوشلزم فراڈ ہے؟“

حکیم آزاد شیرازی

روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۱ جولائی ۶٦۶

” نوائے وقت “ (۲۹ جون) میں جناب عبداللہ حُر صاحب نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین اے کے سومار کے اعلان کا نہایت صحیح تعاقب کیا تھا کہ ”اسلامی سوشلزم ایک بہت بڑا فراڈ ہے ؟“ ۔ موصوف نے علامہ اقبال ، قائداعظم اور صدر ایوب خاں کے بیانات کے حوالوں سے بلاشبہہ ایک مختصر، جامع اور ناقابل تردید مقالہ لکھا تھا۔ اس کے جواب میں (نوائے وقت، ۹ جولائی) میں ایم ایچ حکیم گجرات کا مقالہ بھی نظر سے گزرا جس میں صاحب مضمون نے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ” کسی اسلامی معاشرے میں دولت کی مساوی تقسیم جبراً بروئے کار نہیں لائی جا سکتی ۔“ انھوں نے عہد نبوی اور خلافت راشدہ کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہوئے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ ” اسلام کی ساری تاریخ پر نظر دوڑائیے—کیا آپ کو کسی زمانے میں بھی دولت کی مساوی تقسیم موجود نظر آئے گی ؟“ دوسرا سوال انھوں نے یہ کیا ہے کہ ” اسلام نے بطور دین اس بارے میں کیا احکام یا ہدایات دی ہیں ؟“

موصوف کے پہلے سوال کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ کسی ارشاد ربانی یا حکم نبوی پر عمل نہ کرنے سے فرمانِ خداوندی اور ارشاد نبوی کا ابطال ہرگز لازم نہیں آتا ۔ آج اگر مسلمان کہلانے والے دنیا بھر کے لوگ اپنی زندگیوں کو قرآنی سانچے میں ڈھالنے پر آمادہ نہیں تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن نے سرے سے کوئی نظام حیات متعین ہی نہیں کیا—یا قرآن کا مقرر کردہ نظام ناقابل عمل ہے ۔ اس قسم کا غلط نتیجہ نکالنے والے انسان کو نہایت کھلے لفظوں میں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا طریق مقرر کیا ہے جس پر انسان عمل ہی نہیں کر سکتے ۔

ان کے دوسرے سوال کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے ۔ تاہم ان کی

اطلاع کے لیے قرآن حکیم ، احادیث نبوی اور خلفائے راشدہ کے اقوال اور طرز عمل کے چند حوالے دے رہا ہوں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ " اسلام نے بطور دین اس بارے میں کیا احکام یا ہدایات دی ہیں ۔"

قرآن حکیم

قرآن حکیم ، میں جو اسلام کا دستور اساسی ہے ، ارشاد باری تعالیٰ ہے : " جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقے سے (فی سبیل اللہ) معاشرے کی بہتری کے لیے خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دو ۔ اس دن ان پر وہی اندوختہ جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا ، پھر اس سے ان کی پشتیں ، پہلو اور پیشانیاں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے جمع کر رکھا تھا اس کا مزہ چکھو ۔ "

" یہ لوگ تم سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں ۔ انہیں کہیے ، جو کچھ اپنی ضروریات سے زاید ہو ۔"

" انفاق فی سبیل اللہ کی راہ اختیار کرو اور اپنے ہاتھوں آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو ۔"

" تم نیکی تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک تم اپنی متاع عزیز کو دوسروں کے لیے صرف نہ کرو "

" مسلمان اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں ، خواہ خود تنگی کی حالت میں ہوں ۔"

احادیث نبوی

" اے ابن آدم ! تیرے لیے ضرورت سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہتر ہے اور اسے روک رکھنا برے نتائج کا حامل ہے (مسلم شریف ، ترمذی شریف) ۔

" جس بستی میں کوئی شخص صبح اس حال میں اٹھا کہ وہ رات بھر بھوکا رہا تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ پر اس بستی کے بقاء و تحفظ کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہ جاتی (مسند امام احمد بن حنبل) ۔

" لوگو ! زمین اللہ کی ہے اسے کاہے کو بانٹتے پھرتے ہو ۔ جتنی زمین میں ہل چلا سکتے ہو ، اتنی ہی اپنے پاس رکھو (مسند کبیر)۔علامہ اقبال نے اس ضمن میں فرمایا ہے :

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
دہ خدایا ! یہ زمیں میری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں میری نہیں

خلافت راشدہ میں

حضرت ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں تقسیم اموال کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان اختلاف رائے ہؤا ۔ حضرت ابوبکر اس خیال پر پختگی سے قائم تھے کہ تقسیم اموال مساوی طور پر ہو لیکن حضرت عمر اور صحابۂ کرام کا ایک گروہ اس بات پر مصر تھا کہ جن لوگوں نے قبول اسلام کے سلسلے میں پہل کی ہے انھیں مقدم رکھا جائے۔اس اختلاف کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا '' تم نے جس اولیت اور افضلیت کا ذکر کیا ہے میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں لیکن یہ ایک ایسا عمل ہے جس کا انعام اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا ۔ معاش کے معاملے میں مساوات برتنا ترجیحی سلوک سے بہتر ہے ''۔چنانچہ حضرت ابوبکر اپنی رائے پر آخر دم تک قائم رہے اور عہد صدیقی میں مساوات کا اصول کار فرما رہا ۔

جب حضرت عمر فاروق خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق عمل شروع کیا ۔ ان کا خیال تھا کہ ''جن لوگوں نے پیغمبر خدا کے خلاف جنگ کی ہے انھیں میں ان لوگوں کے برابر حصہ نہیں دوں گا جو آپؐ کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں ۔'' لیکن حضرت عمر نے اپنے اس اجتہادی مسلک کے نتائج محسوس کرتے ہوئے زندگی کے آخری دنوں میں اعلان فرمایا '' اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو عطایا میں سب کے حصے مساوی ہوں گے اور اغنیا سے زائد از ضرورت مال لے کر فقراً میں تقسیم کروں گا۔'' لیکن اگلے سال سے پہلے آپ نے جام شہادت نوش فرمایا ۔

جب حضرت عثمانؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے عطایا میں تفاوت کو بھی برقرار رکھا اور زائد از ضرورت مال بھی دولت مندوں کے پاس رہنے دیا جس سے مال دار زیادہ مال دار ، اور غریب زیادہ غریب ہونے لگے ۔ عہد عثمانی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرغفاری نے حضرت عثمان کے اس رویے پر اختلاف ظاہر

کیا اور کہا کہ وہ بیت‌المال سے لاکھوں کی رقمیں انعام کے طور نہ دیا کریں ۔ آپ نے فرمایا ” لوگو ! اب ایسے کام کیے جانے لگے ہیں جو میری سمجھ سے بالاتر ہیں ، خدا کی قسم نہ تو کتاب میں ان کی کوئی سند ہے نہ پیغمبر خدا کی سنت میں ۔ واللہ میری بدنصیب آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ حق پامال کیا جا رہا ہے اور غیر متقی لوگوں کو ترجیح دی جا رہی ہے ۔ اے مالدارو ! غریبوں کی طرف دیکھو اور اے سونا چاندی جمع کرنے والو ! یاد رکھو کہ اسی دولت سے تمہاری پیشانیوں ، پیٹھوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا ۔ اے دولت جمع کرنے والے جان لے کہ دولت میں تین شریک ہیں : اول تقدیر جو تجھ سے اجازت لیے بغیر تباہی یا موت کے ذریعے تیری دولت لے جائے گی ۔ دوسرے وارث ہے جو منتظر ہے کہ تیری آنکھیں بند ہوں اور وہ دولت پر قبضہ کرے۔ تیسرا تو خود ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ ان میں سے کمزور شریک بن کر نہ رہے تو ضرور اس کا انتظام کر اور لن تنالوالبرّ حتّٰی تنفقوا مما تحبّون پر عمل کر ۔ لوگو ! تم اب ریشمی پردے اور دیبا کے گاؤ تکیے استعمال کرنے لگے ہو اور اب تمہیں آذربائیجان کے بنے ہوئے عمدہ نمدے پر سونے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے جب کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سویا کرتے تھے ۔ تمہارے ہاں اب رنگا رنگ کے کھانوں کے دور چلتے ہیں جب کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کی روٹی پیٹ بھر میسر نہ تھی۔ “

حضرت علی خلیفہ ہوئے تو انھوں نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اپنے پہلے خطبے میں اعلان کیا۔” لوگو ! اچھی طرح سن لو کہ صحابہ میں سے مہاجر ہو یا انصار جس شخص کا بھی یہ خیال ہو کہ صحبت رسولؐ کی بنا پر اسے دوسروں پر فضیلت ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ فضیلت کل اللہ کے ہاں کام آئے گی اور اس کا اجر وہی دے گا ۔ ویسے تم سب اللہ کے بندے ہو اور مال بھی اللہ کا ہے ، اسے تمہارے درمیان مساوی تقسیم کیا جائے گا ۔ اس کے معاملے میں کسی کو کسی پر افضل نہیں سمجھا جائے گا ۔ ہاں متقی لوگوں کے لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے بہترین انعام تیار کر رکھا ہے ۔ لوگو ! میں تمہارے درمیان ہی کا ایک آدمی ہوں ۔ تمہاری طرح میرے بھی کچھ حقوق ہیں ۔ اور مجھ پر بھی کچھ ذمہ‌داریاں

ہیں ۔ میں تمھیں حضورؐ کے طریقے پر چلاؤں گا ۔ اللہ کے احکام نافذ کروں گا ۔ سن لو کہ عثمانؓ نے لوگوں کو جتنی بھی جاگیریں عطا کی تھیں اور جتنا بھی مال انعام و اکرام کے طور پر دیا تھا وہ بیت المال میں واپس لایا جائے گا کیونکہ حق کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی ۔ اگر میں نے یہ دیکھا کہ اس مال سے عورتوں کے ساتھ شادیاں رچائی جا چکی ہیں یا لونڈیاں خریدی جا چکی ہیں یا اس مال کو مختلف ملکوں میں پھیلایا جا چکا ہے تو بھی میں اسے واپس لاؤں گا کیونکہ عدل میں بڑی وسعت ہے ۔ لوگو ! جان لو ایسا نہ ہو کہ کل کو تم میں سے وہ لوگ جن پر دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے اور جو محلات کے مالک بنے ، جنھوں نے نہریں کھدوائیں اور باغات اگائے ، گھوڑوں پر سواری کی اور غلام چھوکروں کو خدمتگار بنایا انھیں جب میں اس عیش و عشرت سے محروم کروں اور انھیں ان کے اصل حقوق پر واپس لاؤں تو وہ کہنے لگیں کہ ابوطالب کے بیٹے نے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کر دیا ۔ "

مجھے توقع ہے کہ ان تصریحات کے بعد جناب ایچ ایم حکیم اور ان کے ہم خیال دوسرے حضرات پر یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ اسلامی سوشلزم ہرگز فراڈ نہیں ، بلکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام فراڈ ہے جس پر اسلام کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے ، یہی فراڈ اور بہت بڑا فراڈ ہے ۔

مضمون

اسلامی سوشلزم ــ ایک زندہ حقیقت

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار ؟

روزنامہ نوائے وقت لاہور ، ۲۷ جولائی ۶۶ء

چودھری محمد احسن ۔ گجرات

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح سے جن اصحاب کو چڑ ہے ان کے خیالات ان کی طرف سے ، اپنے علم و حکمت کے دعویٰ کے باوجود ، " بےنصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ " کے آئینہ دار ہیں ۔ ایسے اصحاب عموماً اسلامی سوشلزم کو دولت کی تقسیم یا قومی ملکیت تک محدود کر کے کمیونسٹوں کی بے دینی کے ساتھ غلط ملط کرتے اور اس طرح اسلام کے تصورِ خدا اور دینِ حق کے خلاف ظاہر کرتے ہیں ۔ یہ ذاتی ملکیت کا

چکر اور بے دینی کا ہو"؎ انہیں اسلامی سوشلزم کی برکات و فیوض کے ادراک سے محروم کر دیتا ہے اور وہ بھول جاتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ استحصال انسان کو نہ انسانوں کا رہنے دیتا ہے نہ خدا کا بلکہ صرف دولت کی دیوی کا پجاری بنا دیتا ہے۔ ہمارے ہاں قریباً ایسی ہی صورت حال ہے۔ ہم پاکستان کے سیاسی نظریات بھولے ہوئے ہیں اور زبان سے اگر عوامی پسند و رجحان کی وجہ سے کچھ کہنے کو مجبور بھی ہو جائیں تو بھی عمل اس کے بالکل برعکس رہتا ہے۔ نہ صرف قول و فعل میں تضاد ہے بلکہ اب تو مخصوص مفادات کے دباؤ میں آ کر اقوال میں بھی تضاد پیدا ہو رہا ہے۔ نام نہاد پریس ٹرسٹ کے چیرمین اے کے سومار صاحب نے اسلامی سوشلزم کے خلاف اپنی تقریر اور مضمون میں علامہ اقبالؒ کے ایک ارشاد " لا کلیسا لا سلاطین لا الله " کو بھی استعمال کیا ہے لیکن افسوس کہ وہ علامہؒ کے اصل پیغام سے فیض یاب نہیں ہو سکے۔ صرف اپنے مطلب کی بات یاد رکھنے کی کوشش کی.......اور یہ غلط استعمال کی روش نئی نہیں۔ اگر سومار صاحب نے سید جمال الدین افغانیؒ کی زبانی علامہ کا "پیغام بہ ملت روسیہ" پڑھ لیا ہوتا تو صرف اسی ایک مصرع پر اکتفا نہ کرتے۔ چین کے دورے سے واپسی پر اکتوبر ۶۵ء میں انہوں نے جو بیان دیا اس کے بعد ان کے منہ سے زیر بحث تقریر زیب نہ دیتی تھی لیکن مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ تاہم ان کے اس بیان اور تازہ تقریر کا موازنہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوگا کہ بیان حقیقت و صداقت پر مبنی تھا اور تقریر میں حقیقت، صداقت اور صحیح اصولوں سے فرار ہے۔ بیان میں سومار صاحب نے فرمایا تھا کہ " گو وہ خود نجی سرمایہ کاری کے حق میں ہیں لیکن وہ چین سے یہ تاثر لے کر آئے ہیں کہ چینی لوگ غیر شعوری طور پر اسلام کے معاشرتی اصولوں اور معاشی انصاف کا نفاذ کر رہے ہیں البتہ خدا کے تصور سے عاری ہیں۔" انہوں نے مزید کہا تھا کہ " پاکستان کے لیے بھی، جو ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے، اسلامی معاشی مساوات و اقدار اور معاشرتی انصاف کے اصول اپنانے ضروری ہیں " (پاکستان ٹائمز ۶۵-۱۰-۱۹)۔ چین کے معاشی و معاشرتی نظام کی اس حد تک مدح سرائی کے بعد اب " اسلامی سوشلزم " کی اس طرح مخالفت میں زور بیان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مخصوص مفادات کی جن دیواروں میں گھرے ہوئے ہیں وہ ایسے حقائق نہیں

دیکھ سکتے ۔

سومار صاحب کی حمایت میں پروفیسر حکیم صاحب نے یہ مثال دی ہے کہ جس طرح اسلام میں جبراً مسلمان نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح اسلام میں دولت کی مساوی تقسیم بھی جبراً بروئے کار نہیں لائی جا سکتی ۔ لیکن وہ اس حکمتِ خداوندی کو بھول گئے یا سمجھ نہیں سکے کہ دھوکے سے کم تول دے کر یعنی ناجائز اور چور ذرائع سے دولتِ حرام پیدا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اسراف سے منع فرمایا اور '' قل العفو '' کا فرمان جاری فرمایا لیکن یہ حکم کہ '' ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ '' ہم بھول چکے ہیں چنانچہ ایسا نہ کرنے والے ناجائز دولت پیدا کرنے اور اس سے چمٹنے والے ، یعنی خدا اور رسولِ خدا کے احکام کو اس ملک میں (جو اللہ اور رسول اللہؐ کے نام سے اور ان کے احکام کی پابندی کے اعلان اور وعدے سے حاصل کیا گیا تھا) پس پشت ڈالنے والوں کو ان کا پابند بنانے کے لیے ضروری اقدامات جائز ہیں اور یہ جبر نہیں بلکہ کیے گئے قومی وعدوں کو پورا کرنے کے مترادف ہے اور اس میں کوتاہی قومی گناہ ہے :

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس لیے قانون قدرت کی گرفت سے بچنے کے لیے ضروری اقدامات پر چیں بہ جبیں ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔ حکیم صاحب کا کہنا کہ مساوی تقسیمِ دولت کبھی نہیں ہوئی درست نہیں ، اور شیرازی صاحب نے اس کا خوب جواب دے دیا ہے ۔ اللہ اور رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ رزق حلال کھاؤ حرام نہ کھاؤ ۔ حرام حرام ہے خواہ تھوڑی مقدار میں ہو ! شراب ہر حالت میں حرام ہے ، پرمٹ لینے سے شراب حلال نہیں ہو سکتی ! بلیک یا رشوت وغیرہ ناجائز ذرائع سے پیدا کردہ دولت حرام ہے ، بنک میں جمع کرا دینے یا کوٹھیاں اور ملیں بنا لینے سے حلال نہیں ہو جاتی ۔ ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی دولت کو مساوی و منصفانہ تقسیم کے ذریعے اصل حقداروں کو دے کر سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کسی کی ذاتی دولت کا جبری حصول نہیں بلکہ سرمایے کے جبری معاشی استحصال کے شکار حقداروں کی حق رسی ہے ۔ ایم ایچ حکیم صاحب نے '' لیس للانسان الاما سعیٰ'' کا استعمال تو کیا مگر اس کی حکمت سمجھنے سے قاصر رہے۔ حکیم الامت

اقبال نے اسی فرمان خدا کو سمجھانے کے لیے فرمایا ہے :

کارخانے کا ہے مالک مردک ِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے لیس للانسان الا ماسعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی سرمایہ داروں کی ناجائز دولت کو قوم میں تقسیم کرنا حکیم صاحب کے نزدیک درست نہیں ۔ حکیم صاحب دولت کو انسانی اقدار پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ اسلام انسانی اقدار پر دولت کو نچھاور کرتا اور منصفانہ تقسیم دولت کے ذریعے انصاف و مساوات کا جھنڈا بلند کرتا ہے ۔ دولت پسندوں اور انسانیت کے علمبرداروں کی حکمت کے زاویے مختلف ہیں۔ سرمایہ داری کے حق میں دلائل پیش کرنے والے ایسے ہی حکماء سے اقبال خطاب کرکے کہتے ہیں :

پئے جرم او پوزش آوردہ
بایں عقل و دانش فسوں خوردہ

مال ِ غنیمت کی اصطلاح دراصل دور جہالت کی یادگار ہے جو غلط العام ہو کر اسلامی دور میں بھی استعمال ہوتی رہی ۔ مال غنیمت سے مراد یہ تھی کہ جو کچھ دوران جنگ کسی کے ہاتھ لگا وہ اس کا ہو گیا ۔ لیکن اسلامی دور نے اس کو بھی یکسر بدل دیا ۔ اور اب یہ سب مال ملت کا ہوتا تھا جو مساوی تقسیم ہوتا یا بیت المال میں جمع کیا جاتا ۔ اسلام میں مال غنیمت یعنی مال ملت سے لے کر دولت و ذرائع آمدن ہر قسم اور خصوصاً قدرتی و مشینی طاقت والے ذرائع آمدن تمام تر قومی ملکیت بن کر شخصی مفاد کے بجائے قومی تعمیر و ترقی اور عوامی مفاد کے ضامن ہوتے ہیں نہ کہ چند افراد یا خاندانوں کے ۔ اشخاص کو مراتب کی تقسیم میں چھوٹے بڑے مرتبے تقسیم ہوتے ہیں اور انصاف کے تقاضے عہدوں کی تقسیم میں بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں اور حسب مراتب ضروریات کے مطابق دولت کی تقسیم کا نظریہ ارتکاز دولت کو ختم کرتا ہے اور دولت کی ریل پیل کی اجازت نہیں دیتا ۔ اسلام دین ِ فطرت ہے جو نہ صرف مذہبی عقائد کے مسائل بتاتا ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسانی اقدار کو بلند کرنے کے معاشی و معاشرتی و عدالتی وغیرہ اصولوں کی پابندی سکھاتا ہے ۔ اس کا دائرہ وسیع تر ہے اور نظام بہترین ۔ اس نظام حیات کا نام دین ِ اسلام

یا اسلامی سوشلزم ہے اور اگر کسی کو اس پر اعتراض ہو تو " دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور " جس میں نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ و قربانی سے لے کر تجارت و کاروبار کے ، والدین و اولاد کے ، خاوند اور بیوی کے ، شہری اور پڑوسی کے تعلقات و حقوق و فرائض ! انتظامیہ ، عدلیہ ، حکومت کے اہلکاروں و سیاستدانوں کے فرائض منصبی واضح طور پر بتائے گئے ہیں ۔ سیاست کو دین کے تابع رکھ کر عدل و انصاف کے ذریعے انسانی وقار کا ضامن ، دولت کی منصفانہ تقسیم سے مساوات واخوت کا حامل بنانے والا اور معاشی استحصال کی بیخ کنی کرنے والا یہ نظام انسانیت کی فلاح کا سرچشمۂ رحمت ہے جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

حضرت ابوبکر صدیق رض اپنا تمام اثاثہ حضور سرور کائنات ص کی خدمت اقدس میں اس جذبے سے پیش کرتے ہیں کہ

پروانے کو ہے شمع اور بلبل کو پھول بس
صدیق رض کے لیے ہے خدا کا رسول ص بس

حضرت عمر رض خطاب اس وقت تک جو کی روٹی کھاتے اور گندم استعمال کرنے سے انکار کرتے ہیں جب تک مملکت میں ہر فرد کو گندم میسر نہ آ جائے ۔

حضرت عمر رض اپنے کندھوں پر آٹے کی بوری اٹھا کر یتیم بچوں اور بیوہ کے گھر رات کے وقت پہنچاتے ہیں ۔

حضرت عمر رض اپنے بیٹے کو جرم کی پاداش میں کوڑے لگواتے ہیں ۔

حضرت عمر رض خطبۂ جمعہ کے دوران ایک سوال یا اعتراض کا جواب نہایت خندہ پیشانی سے دیتے ہیں کہ ان کے چوغے میں حصے سے زاید کپڑا کیوں کر لگا ہؤا ہے ۔

حضرت عمر رض ملک شام کو اپنی ایک جھلک سے فتح کر لیتے ہیں کہ جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو آخری منزل میں اونٹ کی مہار پکڑے چل رہے تھے اور غلام اونٹ پر سوار تھا ۔ مساوات کے اس ایک نمونے سے شامیوں پر وہ رعب طاری ہوا کہ انہوں نے بغیر کسی مدافعت یا مزاحمت کے بیت المقدس کی چابیاں خلیفۃ المسلمین کے حضور پیش کر دیں ۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اپنے کنبے کی تمام دولت بیت المال میں جمع کرا دیتے ہیں اور صرف جائز وظیفے پر گذر

کرتے ہیں ۔

سلطان مراد قاضیٔ وقت کی عدالت میں پیش ہو کر معمار کے ہاتھ کاٹنے کا اقبال جرم کرتا اور قرآن کے فتوے کے آگے سر تسلیم خم کرکے اپنے ہاتھ کٹوانے کو پیش کر دیتا ہے جس پر معذور فریادی معمار کو تاب خاموشی نہ رہی اور ”از برائے مصطفٰی بخشیدش“ کہہ کر سلطان کو معاف کر دیتا ہے ۔ اس ضمن میں اقبالؒ نے لکھا :

یافت مورے بر سلیماں نے ظفر
سطوتِ آئین پیغمبر نگر

یہ آئین پیغمبر جس میں ”نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز“ حلال و حرام کی تمیز کا لازوال سرچشمہ ، انسانی حقوق و فرائض کا بے لاگ آئینہ ، زندگی کے ہر شعبے کے لیے کامل دستورِ ہدایت اور نظام حیات کا ابدی نسخۂ کیمیا ، اسلامی سوشلزم ہے۔ اس سے انکار کرنا حق و صداقت کا منہ چڑانا ہے یا بے بصرتی کا ثبوت ۔

خط

روزنامہ ”ڈان“ کراچی ، ۸ جولائی ۱۹۶۶

جناب من !

آپ کے اخبار میں ۲۶ جون ۱۹۶۶ء کو جناب اے کے سومار ، چیرمین نیشنل پریس ٹرسٹ کی ایک تقریر شائع ہوئی تھی ۔ اس تقریر میں مسٹر سومار نے اسلامی سوشلزم کے بارے میں چند ناجائز باتیں کہی ہیں ۔ اس بات کا سخت افسوس ہے کہ وہ اپنے طبقے کی وکالت کے جوش میں اپنے آپے سے باہر ہو گئے ہیں ۔ ہمارے اخبارات آزاد ہیں چنانچہ میں اسی موقع پر ان کی غلط بیانی کی تردید کرنے کا حق استعمال کرنا چاہتا ہوں ۔

موصوف نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ اسلام ۱۴ صدی پرانا مذہب ہے ۔ میں ان ۱۴ صدیوں میں سے صرف گذشتہ ۴۰ برس ہی کے طرز فکر کے نچوڑ سے چند حوالے پیش کروں گا ۔

علامہ اقبال کا اسلامی سوشلزم کے ساتھ گہرا لگاؤ اتنا مشہور ہے کہ اُس کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں ، صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس عظیم مسلمان مفکر کی تحریریں (شاعری و نثر دونوں) یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصور اپنی تمام تر اشکال کے ساتھ اُن کے دل سے کتنا قریب تھا ۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے، ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو، چاٹ گام میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا :

" جب آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزمؔ کی ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جو انسانی اخوت اور مساوات کی ضمانت بن جائیں تو آپ نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اسی طرح سے جب آپ یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ ہر ایک انسان کو برابر کے مواقع فراہم ہوں تو آپ میرے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں " ۔

صدر ایوب خان تیسرے پنج سالہ منصوبے کے پیش لفظ میں کہتے ہیں :

" معاشی و معاشرتی شعبوں میں ہماری تمام تر جد و جہد کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے قیام کی طرف تیزی کے ساتھ قدم بڑھائیں۔ " اسلامی سوشلزم " اور "فلاحی ریاست " کی اصطلاحات ایک حد تک متبادل ہیں ۔ جانے پہچانے فلاحی مقاصد کے علاوہ اسلامی سوشلزم کا مطلب ہے کہ ملک کی ثقافتی اور مذہبی میراث کو محفوظ رکھا جائے اور اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ یہ معاشی نشو نما کی جستجو میں تباہ و برباد ہو جائے ۔ اس لیے یہ تصور " فلاحی ریاست " کے تصور سے کہیں وسیع ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے " ۔

صدر ایوب خان نے اپنے انتخابی منشور میں لکھا تھا :

(۱) تمام طبقاتی امتیاز مٹ جانے چاہییں اور اہل پاکستان کو ایک ایسے مثالی معاشرے کی صورت زندگی بسر کرنا اور ترقی کرنا چاہیے جو اسلامی اخوت اور انسانی مساوات پر قائم ہو ۔

(۲) وہ تمام عملی قدم اُٹھانے چاہییں جن سے ایک عام انسان کی آمدنی میں اضافہ ہو اور امیر و غریب کا فرق کم ہو جائے۔

(۳) کارخانہ داروں کے گٹھ جوڑ اور اجارہ داری کو ختم کیا جائے ۔

میں نے اس برصغیر کی زمانۂ قریب کی تاریخ میں سے صرف وہ چار مثالی حوالے دیئے ہیں جو کہ ہو سکتا ہے اُن ذاتِ شریف کی سیاسی حس کو بیدار کریں جنھوں نے اپنی تقریر میں اسلامی سوشلزم کو ایک " فراڈ " قرار دیا ہے ۔

اسلامی سوشلزم کو " فراڈ " قرار دینے میں ان بھلے مانس کا

مطلب کیا ہے ؟ یہ فراڈ کس نے کس سے کیا؟ کیا ان صاحب کا مطلب ہے کہ جو قران میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں؟ کیا ان صاحب کا مطلب ہے کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اپنی زندگیاں اس طرح نہ گزاریں جیسے کہ ہم سنتے آئے ہیں ؟ کیا ان صاحب کا مطلب ہے کہ ابو ذر غفاریؓ کی تعلیم صدا بصحرا ثابت ہوئی؟ یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے وقتوں کے مفکرین اور قائدین۔ اقبال ، جناح ، ایوب وغیرہ۔ بے سوچے سمجھے باتیں کرتے رہے ہیں ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ الفظ ایک ایسے طبقے کا واویلہ تو نہیں جس کو معلوم ہے کہ اسلام کی پوری طرح سے پیروی ان کے واسطے ہلاکت خیز ثابت ہوگی ۔

اسلام ایک دین اور ایک طریقۂ زندگی ہے ۔ جب ہم اس نور کی شعاعوں کو انسانی تجربے کے شیشے سے گزارتے ہیں تو طرح طرح کے چمکتے دمکتے رنگوں اور سایوں کا ایک ترتیب وار سلسلہ قائم ہو جاتا ہے ۔ اسلام کے معاشی اور معاشرتی پہلو اس قوسِ قزح کے لازمی رنگ ہیں اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کے یہ کُل کا ایک حصہ بھی ہیں ۔ ان سے عہدہ برا ہوئے بغیر اسلام پر عمل نہیں کیا جا سکتا ۔

آپکا " خوددار مسلمان " لاہور ۔

خط

روز نامہ " ڈان " کراچی ، ۱۱ جولائی ۱۹۶۶ء

جناب من !

اسلامی سوشلزم کے ضمن میں ۸ جولائی کے " ڈان " میں " خوددار مسلمان " کا ایک خط پڑھا ۔ انھوں نے یہ خط لکھ کر پاکستان میں اسلام کی ایک عظیم اور بروقت خدمت کی ہے ۔ اس خط کو چھاپنے پر " ڈان " بھی تعریف کا مستحق ہے ۔ " خوددار مسلمان " کو خاطر جمع رکھنی چاہیے کیونکہ اسلامی سوشلزم کا تصور پاکستان کے تقریباً تمام مسلمانوں کے لیے فخر کا باعث ہے ، سوائے جدید سرمایہ داروں کی اُس چھوٹی سی ٹولی کے جس کا ایک مثالی نمونہ جناب اے کے سومار ہیں جنھوں نے اسلامی سوشلزم کی مذمت کرتے ہوئے اُس کو ایک " فراڈ " قرار دیا ہے ۔

اسلامی سوشلزم کے موثر داعیوں کی حیثیت سے ، آپ کے نامہ نگار نے ، اقبال ، قائد اعظم اور ہمارے موجودہ قومی سربراہ کے حوالے دیے ہیں ۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سوشلزم اسلام کے انقلاب انگیز تصور

کا ایک اہم جز ہے کئی اور حوالے بھی دیے جا سکتے ہیں - اب ہم جناب سومار جیسے لوگوں کی روشن خیالی پر مزید بھروسا نہیں کر سکتے - یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے پاکستان میں صنعت کے فروغ سے ابھرنے والے ناگزیر حالات سے فائدہ اٹھا کر خوب دولت بٹوری ہے اور جو اب بھی حکومت کی لاانتہا سخاوت اور عام انسان کی محنت کے بل بوتے پر خوب دولت بٹور رہے ہیں - کیا صنعت کاروں کا یہ چھوٹا مگر بے حد طاقت ور طبقہ ایک " محفوظ منڈی " کے دائرے سے باہر پنپ سکتا ہے ؟ کیا یہ طبقہ ملک کی معاشی ترقی میں کوئی قابل ذکر اور ٹھوس حصہ لے سکا ہے ، سوائے اس کے کہ حکومت کو ۱۹۵۹ء کے اوائل میں ، عارضی ہی نہیں بلکہ ناگہانی حالات کے تحت ، " ایکسپورٹ بونس سکیم " شروع کرنی پڑی جو کہ آج اس محدود طبقے کے بڑھتے ہوئے رسوخ کی وجہ سے ہماری معیشت کا ایک باقاعدہ حصہ بن گئی ہے ؟ آزادی سے لے کر آج تلک لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ ہماری صنعتی ترقی کے لیے صرف کیا جا چکا ہے مگر کیا ہمارے صنعتی ادارے غیر ملکی مصنوعات سے سستی مصنوعات بنا پائے ہیں ؟ اپنی مصنوعات کو ، بناوٹی حالات کی مدد کے بغیر ، برآمد کرکے زر مبادلہ کمانے کے بجائے ، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کرخانہ دار پاکستان کی " محفوظ منڈی " کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عام انسان کے بل بوتے پر خوب پھول رہے ہیں - جو کچھ زر مبادلہ بھی یہ کما سکتے تھے وہ یا تو حکومت کے نافذ شدہ قوانین کے باعث تھا یا اُن قوانین کے تحت تھا جنھیں نافذ کرانے کی کوشش کی گئی - حکومت کے اعلیٰ افسر ، دن رات ، یہ بتاتے رہتے ہیں کہ ہماری صنعتی معیشت کو وسیع کیا جا رہا ہے تاکہ عام انسان بھی " صنعتی کارخانہ داری کی رحمت " سے فیض یاب ہو سکے - تاہم اس طرح کے اعلانات ایک عام انسان کا صرف دل ہی بہلاتے رہے ہیں -

جناب سومار کے اس بیان پر غور کرتے ہوئے کہ اسلامی سوشلزم ایک " فراڈ " ہے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن پر حکومت کو غور کرنا چاہیے - اسلامی سوشلزم صدر ایوب خان کے مشہور انتخابی منشور کا ایک لازمی اور اہم حصہ ہے جس کی بنا پر پاکستان مسلم لیگ نے پچھلے عام انتخابات میں حصہ لیا تھا - جناب سومار انتخابات میں اسی

منشور کی بنا پر منتخب ہوئے تھے ۔ کیا مندرجہ ذیل دو وجوہات کی بنا پر اُن کو استعفیٰ دینا ، یا اُن سے استعفیٰ دلوانا ، نہیں چاہیے ؟

۱ ۔ رائے دہندوں سے وعدہ خلافی

۲ ۔ سیاسی جماعت کے دستور العمل کی خلاف ورزی

اور ہاں ، نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیرمین کی حیثیت سے ، کیا جناب سومار سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ صدر کے منشور کی روشنی میں قوم کو یا قومی اخبارات کو کوئی صحیح راستہ دکھائیں گے ؟

آپکا " **ایک اور خود دار مسلمان** " ۔ کراچی

خط

روزنامہ "ڈان" کراچی ، ۱۸ جولائی ۱۹٦٦ء

جناب من !

مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے اخبار کی وساطت سے ، اسلامی سوشلزم کی باتحقیق تفسیر پر ، " خود دار مسلمان " اور " ایک اور خود دار مسلمان " کو دلی مبارک باد پیش کروں ۔ اب جناب سومار کا مغالطہ دور ہو جانا چاہیے اور گزرے زمانے کی یاد بھی کچھ تازہ ہو جانی چاہیے ۔ ہمارے ہردلعزیز رہنما (صدر ایوب) کی اپنی تقاریر ، گفتگو اور تحریر میں پیش شدہ قطعی نظریوں کے سخت برخلاف ، میں نے خود ، جناب سومار کو چند گنے چنے سرمایہ داروں کی وکالت مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے سنا ہے :

" جس طرح ریاضی کے اصول کے تحت دو ہندسوں کو باہم ضرب دینے سے اعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اسی طرح دولت کو بھی امیروں کے ہاتھوں میں پھولنے پھلنے سے آپ روک نہیں سکتے ۔ ہم کو برلا ، بنگور ، فورڈ ، داؤد ، والیکا اور فینسی جیسے اور لوگوں کی ضرورت ہے تاکہ ہم غرباء کی اور زیادہ دستگیری کر سکیں " ۔

" غریبی ، بیماری اور جہالت ختم کرنے کے لیے " جناب سومار کا پیش کردہ یہ ایک نرالا نظریہ ہے ۔ سیاست میں شمولیت کے بعد ، ایک ابتدائی سبق کی طرح ، یہ مقولہ بھی انھوں نے حال ہی میں اپنایا ہے ۔

٦ جولائی ۱۹٦٦ء کو ، روٹری کلب کے سالانہ جلسۂ عام میں ، اپنی تقریر میں جناب ایس اے حسنی نے ان کو ٹھیک ہی تو آڑے ہاتھوں لیا تھا

جب اُنھوں نے فرمایا تھا کہ اسلامی سوشلزم کے نقاد بڑی حد تک سرمایہ داری کے نقیب ہیں اور ان لوگوں نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ہے ۔ اس نکتے پر سرمایہ دار حضرات تو خاموش ہیں ، اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے ، مگر جناب سومار ہیں کہ ان کی وکالت پر تلے نظر آتے ہیں اور اسلام کے معاشی تصور کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں ۔

اگر " ان بھلے مانس " کا خیال ہے کہ انھوں نے ہمارے وقتوں کے رہنماؤں یعنی اقبال ، قائداعظم اور ایوب خان کو مات دی ہے تو وہ سراسر غلطی پر ہیں ۔ ان لوگوں کو پوری طرح سے معلوم تھا کہ وہ کس مسئلے پر بات چیت کر رہے ہیں ۔ کم از کم یہ لوگ جناب سومار سے تو کچھ زیادہ ہی جانتے تھے ۔ ۱۹۶۲ء میں ، بیچ لگژری ہوٹل میں منعقد ہونے والے ایوانِ تجارت کے سالانہ عشائیے کے موقع پر ، صدر ایوب خان نے خود ، کوئی ایک ہزار سامعین کی موجودگی میں ، ہنسی اور تالیوں کے شور کے درمیان ، جناب سومار کو ایک " پیشہ ور تقریر باز " اور " ضرورت سے زیادہ بولنے والا " قرار دیا تھا ۔ اس طرح جناب صدر نے جناب سومار کی بظاہر عالمانہ مگر مہمل تقریر کو بڑی فراست کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا ۔

آئیے میں " خود دار مسلمان " کے معقول سوال " یہ فراڈ کس نے کس سے کیا ہے " ؟ کا جواب دوں ۔ سادہ لوح لوگوں سے اس فراڈ کا ارتکاب ایک ایسے جدید سرمایہ دار نے کیا ہے جو ایک ہی سانس میں اسلام سے محبت اور نفرت دونوں ظاہر کرکے لوگوں کو بیوقوف بناتا ہے اور اپنی انا کے زعم میں سمجھتا ہے کہ اس جوڑ توڑ کی بنا پر وہ کوئی عظیم شے ہے ۔

یہ طریقہ ایک ایسے چھوٹے انسان کا ہے جو بغیر کسی تناسب کے اپنی اوقات سے بڑھ جائے اور پھر اپنے کو منظر عام پر لانے کے لیے کسی بھی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہ کرے ۔

آپکا " جدید مسلمان "

مضمون

اسلام سوشلزم کے سہارے کا محتاج نہیں

عبدالکریم سومار ، رکن قومی اسمبلی

روزنامہ مشرق لاہور ، ۲۲ جولائی ۶۶ء

۲۴ جون ۱۹۶۶ء کو قومی اسمبلی میں میری تقریر کی اشاعت کے بعد سے اخبارات میں مضامین ، اداریوں اور خطوط کا ایک طوفانی سلسلہ شروع ہے جن میں سے بیشتر تند و تلخ نکتہ چینی سے لبریز ہیں - مجھے خوشی ہے کہ میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ، ان سے لوگوں نے دلچسپی لی لیکن مجھے اسی قدر مایوسی ہوئی کیونکہ میرے نکتہ چینوں نے میرے خیالات کا تجزیہ نہیں کیا اور نہ میری منطق اور دلائل کو اپنے دلائل سے رد کیا -

اس کے برعکس ، ایک آدھ کے سوا ، سب نے میری تقریر کے سیاق و سباق سے الفاظ اور فقرے الگ کرکے مجھ سے اغراض منسوب کرنے اور مجھے بدنام کرنے کی مہم شروع کر دی ہے - یہ رویہ ایک ایسے موضوع کی جانب ، جس پر ٹھنڈے دل سے اور پوری بے لوثی کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے ، حد درجہ مضرت رساں ہے - قومی مسائل پر آزادانہ غور و بحث کے امکانات کو اس رویے سے صدمہ پہنچتا ہے اور عقلی نظریات کے نشو و ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے - '' اسلامی سوشلزم '' کے موضوع پر میرے خیالات اسمبلی کے ریکارڈ سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

مکمل ضابطہ حیات

'' جناب عالی ! میرے خیال میں ، اسلامی سوشلزم کا نظریہ ، اور تصور ، بجائے خود ایک خطرناک تصور ہے اور اسلام کے ساتھ ایک فراڈ ہے - جیسا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے ، سوشلزم کوئی دو صدی پہلے وجود میں آئی اور یہ اوون نہ تھا جس نے سوشلزم کا تصور دیا ، وہ تو چند فرانسیسی مفکر تھے جنھوں نے سوشلزم کو بطور ایک اصول کے ، سوچا ، لیکن یہ اصول کبھی مکمل کرنے کی نوبت نہیں آئی - ان کے بعد

اوون آتا ہے اور اوون کے بعد کارل مارکس آیا جس نے اس اصول کو ترقی دے کر ایک باضابطہ اور قابل قبول سائنس کا درجہ دیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اوون اور فرانسیسی دانشوروں کو شامل کر لینے کے باوجود سوشلزم زیادہ سے زیادہ دو صدی پرانی ہے ۔ اسلام نے سوشلزم سے کچھ نہیں لیا ۔ اسے کسی تعاون ، کسی راہنمائی ، سوشلزم کے کسی فلسفے یا کسی اور مسلک یا نظریے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں نے ، اور جانتا ہوں کہ خود میں نے بھی بعض دفعہ یہ اصطلاح استعمال کی ۔ لیکن جب میں نے اس پر غور و فکر کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ صریح غلطی ہے جسے بہت سے سادہ دل لوگ سوشلزم اور اسلام کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے کی وجہ سے نادانستہ طور پر روا رکھتے آئے ہیں ۔

جناب عالی ! شاہ صاحب کو یقیناً یہ علم ہو گا کہ مشہور فلسفی ہیگل نے جدلیاتی طریقہ وضع کیا تھا ۔ یعنی تھیسس ، اینٹی تھیسس اور سنتھیسس کا طریقہ ۔ اس کے مطابق اگر سوشلزم ایک تھیسس ہے یا اسلام تھیسس ہے اور سوشلزم اینٹی تھیسس ہے تو یہ گویا سوشلزم اور اسلام کے درمیان یکجائی تلاش کرنے کی کوشش ہو گی اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تصور کو خود اسلام کے حق میں انتہائی خطرناک قرار دیتا ہوں ۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے اسلام ایک مسلک زندگی ہے ، مکمل اور بھر پور ، اور اسے اپنی تکمیل کے لیے قطعاً کسی انسانی امداد کی ضرورت نہیں ۔ ''

میں نے کبھی عالم یا دانش ور ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے غور و فکر کرنے اور اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے ۔ ان پیراگرافوں میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے ، وہ میرے اس عقیدے پر مبنی ہیں کہ اسلام اور سوشلزم دونوں جدا جدا اور مختلف نظریات ہیں ۔ سماجی ، سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں ان دونوں کے مختلف اصول اور قرینے مقرر ہیں ۔ اپنے بنیادی اصولوں کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اگر ان دونوں کے درمیان بعض مشترکہ پہلو موجود بھی ہوں ، تو بھی میرے خیال میں دونوں کو اکٹھا رکھنا ممکن نہیں ، تاوقتیکہ ان دونوں کے اشتراک سے ایک نیا تصور ، ایک نیا فلسفہ یا ایک نیا نظریہ وضع کرنا مقصود نہ ہو جس میں اسلام اور

سوشلزم دونوں کے بعض اصول ، اپنی صوابدید کے مطابق شامل کر لیے جائیں ۔ اس طرح جو نیا نظریہ وجود میں آئے گا اسے نہ تو اسلام کا نام دیا جا سکے گا اور نہ سوشلزم کا ۔ ظاہر ہے کہ کہ یہ بات ممکن ہی نہ ہوگی ۔ اور اسی بناء پر سوشلزم کو اسلامی کہنا اور اسلام کو سوشلزم سے آلودہ کرنا ممکن نہیں ۔

کسی نظریے کی تشکیل میں مبادیات یا فکر کے بنیادی اجزاء کا دخل ہوتا ہے ۔ میں یہ نقطہ نظر صرف اسلام اور سوشلزم کے بارے میں نہیں رکھتا ، بلکہ اسلامی سوشلزم کی طرح اسلامی سرمایہ داری کا بھی کوئی وجود ممکن نہیں ۔ ٹھیک اسی طرح اسلام کو کسی اور ' ازم ' سے نہیں ملایا جا سکتا ۔ " ازم " سے میری مراد ہے ، کسی طرح کا کوئی تصور ، کوئی مسلک ، فلسفہ یا طرز زندگی ۔ میں اس خیال پر سختی سے قائم ہوں کہ اسلام ، سماجی ، سیاسی ، اقتصادی ، غرض کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک مکمل ضابطۂ حیات کا درجہ رکھتا ہے ۔

اسلام کا پیغام

اسلام کی سب سے بنیادی اور اول خصوصیت ہے — اللہ تعالیٰ پر ایمان ۔ توحید پر اور پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ کی رسالت پر اور قرآن کریم پر ایمان ہی پوری اسلامی زندگی کے سرچشمے ہیں ۔ قرآن پاک کی سورۂ مائدہ میں اسلام کے متعلق آیا ہے : " آج کے دن ، میں نے دین کو تم پر مکمل کیا ، اپنی نعمتیں تم پر مکمل کیں اور اسلام کو تمہارا دین قرار دیا ۔ "

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام مکمل اور اکمل ہے ، تمام کوتاہیوں سے پاک ہے اور تمام تبدیلیوں کے امکان سے مبّرا ہے ۔ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں ، اپنی اپنی جگہ پر ، نہ تو مکمل ہیں ، نہ نقائص سے خالی ہیں اور نہ تبدیلیوں کی ضرورت سے آزاد ہیں ۔ دونوں ایک مشترکہ مقصد کے حصول میں کوشاں ہیں ۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں گامزن ہیں ۔ ان کا مقصد مادی خوشحالی کے سوا اور کچھ نہیں ، جس کے حصول کی جد و جہد کے دوران ، یہ دونوں زندگی کی روحانی اقدار سے تجاہل اور لاتعلقی اختیار کرتے ہیں ۔ اگر سرمایہ داری سے استحصال کے عنصر کو ، جو اس کے بنیادی نقائص میں شامل ہے ، خارج کر دیا جائے

جیسا کہ قوم کی اقتصادی زندگی میں ریاست کی بڑھتی ہوئی مداخلت کے ذریعے کوشش کی جا رہی ہے ، اور اس کے ساتھ ہی سوشلزم کے تحت فرد کو بے رحمی سے کچلنے کے رویے میں نرمی پیدا کر لی جائے ، تو ان کوششوں کے باوصف ، سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں ، حصول مقصد کے بعد ، ایک صحت مند انسانی معاشرے کی تشکیل میں ناکام رہیں گے۔ لہذا ایک اسلامی معاشرے کی از سر نو تشکیل کے مرحلے میں ، ہمیں کسی اجنبی فلسفۂ حیات کی طرف دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں ، صرف قرآن اور سنت کا راستہ ہے جس پر گامزن رہ کر ہم ایک مثالی معاشرہ قائم کر سکتے ہیں جو انسانیت کے لیے امن ، ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہو گا۔

مزید براں میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ سوشلزم کو ایک ایسا نظریہ کیوں تسلیم کیا جاتا ہے جو مختلف غیر مربوط اصولوں پر مشتمل ہے اور جس میں سے ہر اصول کو بجائے خود سوشلزم کہا جا سکتا ہے۔

بات مضحکہ خیز ہوگی لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سوشلزم کو اسلام کے ساتھ نتھی کرنے سے لوگوں کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ کیا وہ سوشلزم کے پورے تصور کو اسلام کے ساتھ ملانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہوگا کہ ایسا ہرگز نہیں ، کیونکہ دونوں کے بنیادی اور اصولی اختلافات کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ سوشلزم کے محض چند اصولوں کو اسلام کے ساتھ نتھی کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے۔

پہلا سوال اس موقع پر یہ ہوگا کہ کیا ان اصولوں کو سوشلزم سے الگ کرنے کے بعد بھی انہیں سوشلزم کا نام دیا جا سکے گا ؟

علماء کا فرض

سوشلزم نام ہے اقتصادی ، سماجی اور سیاسی شعبوں میں مختلف اصولوں ، پالیسیوں اور حکمتِ عملیوں کے اتحاد کا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوشلزم کے وہ کون سے اصول ہیں جو اسلام کے اصولوں سے بہتر ہیں یا وہ کون سے اصول ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے اسلام نامکمل رہ جاتا ہے لہذا سوشلزم کے اصولوں کی آمیزش لازمی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بے حد اہم نقطہ ہے اور جو لوگ اسلامی سوشلزم کی وکالت کرتے ہیں انہیں مفاد عامہ کے لیے اس نقطے کی صراحت کرنی پڑے گی۔ اپنی ذات

کی حد تک میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اسلام جامع اور مکمل نہیں ہے یا اسلامی نظریے میں سوشلزم یا کسی دوسرے نظریے کے اصولوں کی شمولیت باقی رہتی ہے۔

میں اس عام خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ جدید دور میں انسانیت کے تمام امراض کا علاج سوشلزم میں موجود ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی نظریے کی تمام و کمال مذمت کرنے لگوں۔ اور بے شبہہ ہر نظریے کی اپنی خصوصیات ہیں۔ لیکن ان نظریات نے نسل انسانی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں انھیں مزید الجھا دیا ہے:

عجب ایں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب ایں است کہ بیمار تو، بیمار تراست

درحقیقت یہ ہمارے عالموں کا کام ہے کہ تحقیق کریں اور معلوم کریں کہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح مسلمانوں کے استعمال میں کب اور کس طرح آئی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اصطلاح مخصوص مقاصد کے لیے رائج کی گئی تھی اور میرے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ سوشلزم نے اگرچہ دنیا میں ہر جگہ انسان کے ذہن پر غیر معمولی اثر چھوڑا ہے، لیکن وہ مسلمان کے ذہن میں اپنی راہ بنانے میں ناکام ہو گئی۔ حتیٰ کہ آج بھی اسلامی دنیا سوشلزم کے اثر سے عملاً آزاد کہی جا سکتی ہے۔ اس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ اسلام کا اثر، تمام اثرات پر غالب ہے۔ چنانچہ اسلامی دنیا میں نہایت چالاکی سے اپنی راہ بنانے کے لیے "اسلامی سوشلزم" کا نظریہ بنایا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کے ذہنوں کو سوشلزم کی حمایت میں آہستہ آہستہ ڈھالا جائے۔

سماجی انصاف

دوسرا سبب غالباً ایک اور ہو سکتا ہے۔ سوشلزم نے انسان کو یہ تاثر دیا ہے کہ وہ مکمل سماجی انصاف کی ضامن ہے اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے تلخ تجربے کی بناء پر لوگوں نے اس تاثر کو بجنسہ قبول کر لیا اور سوشلزم کو سماجی انصاف کی علامت سمجھا جانے لگا۔ چونکہ اسلام سماجی انصاف کا علمبردار ہے لہذا اس پر عقیدے رکھنے والوں نے سماجی انصاف کے اسلامی نظریے کی صراحت کی خاطر "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کسی اندیشے کے بغیر، بے تکلف، استعمال کرنی شروع کر دی۔

تاہم یہ بھی ان کی غلطی تھی ، کیونکہ اسلام نے سماجی انصاف کا جو نظریہ دیا ہے وہ سوشلزم یا کسی بھی نظریے کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ اور ارفع ہے ۔ بہر حال ، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ، یہ کام عالموں کا ہے کہ سب سے پہلے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کا ماخذ دریافت کریں اور دوم یہ فیصلہ کریں کہ میں نے گزشتہ پیراگرافوں میں جو صراحت کی ہے ان کی بنیاد پر مذکورہ اصطلاح کیا مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے اور زیر استعمال آ سکتی ہے ۔

یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ میرے ناقدوں نے مجھے اپنا نظریہ تبدیل کرنے میں کوئی مدد نہیں دی ۔ اس کے برعکس زبردست مخالفت کے باوجود ، میں یہ باور کرنے میں حق بجانب ہوں کہ میرا ہی خیال صداقت پر مبنی ہے ۔ میرا کوئی ارادہ نہیں کہ اس معاملے میں سختی اختیار کروں کیوں کہ یہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں ۔ البتہ پاکستان اور اسلام کے لیے یہ ایک بے حد اہم مسئلہ ہے اور اگر علماء کی اکثریت اس رائے کی تائید کرتی ہے کہ مسلمان ، اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اختیار کر سکتے ہیں ، تو میں اسے یقیناً قبول کر لوں گا اور اس سے مخالف رائے رکھنے پر معذرت بھی کروں گا ۔

اسلامی سرمایہ داری

میرے بیشتر نکتہ چینوں نے بالخصوص کراچی سے شائع ہونے والے شام کے تین اخباروں نے اپنے اداریوں میں ، ایسے الفاظ اور فقرے مجھ سے منسوب کیے ہیں ، جو میں نے ہرگز ادا نہیں کیے اور ایسے خیالات مجھ سے منسوب کیے ہیں ، جو یقیناً میرے نہیں ۔ ایک ایسے ہی اخبار نے ۹ جولائی ۱۹۶۶ء کے اداریے میں لکھا ہے :-

" مسٹر سومار اسلامی سوشلزم کی مذمت بھی کرتے ہیں اور اس کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں اور نجی سرمایہ کاری کے گن گاتے ہیں ، جس پر کسی طرح کی پابندی نہ ہو ۔ "

یہ بات درست نہیں ہے ، جیسا کہ قومی اسمبلی میں میری اسی تقریر کے ایک اقتباس سے ثابت ہو جائے گا :

"جناب عالی ! جہاں تک سرمایہ داری اور سوشلزم کا تعلق ہے ، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ میں اپنی وضع اور اپنے طرزِ فکر کے اعتبار سے

سرمایہ داری کا حامی ہوں ۔ یہ بات درست نہیں ہے ۔ جو کچھ میں کہتا ہوں ، وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری سوشلزم سے بہتر ہے ۔ میں یہ ضرور کہتا ہوں اور اس رائے پر ہمیشہ ثابت قدم رہوں گا ۔ لیکن بہترین نظام اسلامی نظام ہے جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ سوشلزم ۔ جناب عالی ! اسلام ایسا واحد نظام ، واحد نظریہ ، واحد فلسفہ اور وہ واحد طرز زندگی ہے جو نوع انسانی کو اقتصادی ، سماجی ، سیاسی اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں فلاح مہیا کر سکتا ہے ۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ سوشلزم کی طرف مت دیکھو ، سرمایہ داری کی طرف مت دیکھو ، ہاں اسلام کی طرف دیکھو ، کیونکہ پاکستان کے مسائل اور ساری نوع انسانی کے مسائل کا حل اسلام میں ہے ۔ "

ایک اور اخبار نے ۲۹ جون ۱۹۶۶ء کے اداریے میں اسی نکتے پر اپنا زور بیان صرف کیا ہے ، لیکن ایک ایسی زبان استعمال کی ہے ، جس پر اس کے ایڈیٹر کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی ۔ ایڈیٹر نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر میرے خلاف تادیبی کارروائی اور پریس ٹرسٹ کی چیرمینی سے میری برطرفی کا مطالبہ کیا ہے ۔ کاش میرے نکتہ چینوں کو معلوم ہوتا کہ ان کا معاملہ ایک ایسے شخص کے ساتھ نہیں جو سیاست میں عہدوں کا متلاشی رہتا ہے ۔ چیرمین شپ ایک نہیں ایک ہزار چلی جائے لیکن میں سچائی کے مفاد ، پاکستان کے مفاد اور اسلام کے مفاد میں اپنی پرجوش حمایت سے باز نہیں رہ سکتا ۔

تیسرے اخبار نے ۲۸ جون ۱۹۶۶ء کے اداریے میں لکھا ہے :

" جمہور کے اس دور میں ، مستقبل کا رجحان یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ بھلائی ہونی چاہیے ۔ اب خواہ کوئی شخص اس کو فلاحی مملکت کا نام دے ، اسے سماجی انصاف کا اسلامی فلسفہ قرار دے ، پاکستان کا تعمیری منصوبہ کہے یا محض سیدھی سادی سوشلزم کہہ دے ۔ "

یہ اسلام نہیں

مجھے افسوس ہے کہ میں اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا ۔ یہ اسلام نہیں کہ جس چیز کو چاہا ، اسلام کا نام دے دیا ۔ مستقبل کی لہر کیا ہے ، یہ میں نہیں جانتا ۔ لیکن عام انسانوں کا دور یا جمہوری دور

یقیناً تیرہ سو برس پہلے شروع ہو گیا تھا ۔ اور اسی فلسفے کی جانب واپسی زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فلاح کی ضامن اور محافظ ہو سکتی ہے ۔

کراچی کے ایک اردو روزنامے کے اداریے مورخہ ۳۰ جون ۱۹۶۶ء کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر کو قومی اسمبلی میں میری تقریر سے بہت صدمہ پہنچا ۔ ایڈیٹر نے مختلف پیراگرافوں میں اسلام ، سوشلزم اور سرمایہ داری کا فرق صاف لفظوں میں واضح کیا ہے ، اور اسلام کو سوشلزم یا سرمایہ داری کے ساتھ ملانے کے رویے پر شدید احتجاج کیا ہے ۔ کیا میں ان سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ میری تقریر میں کن الفاظ یا فقروں سے یہ تاثر ان تک پہنچا کہ میں نے اسلامی سرمایہ داری کی وکالت کی ہے ۔ انھوں نے اداریہ کی آخری سطر میں یہ مطالبہ کیا ہے کہ اسلام کا دیانت داری سے مطالعہ کیا جانا چاہیے ، کیا میں بددیانت ہوں ، یا ایڈیٹر کو اعتراف کر لینا چاہیے کہ :

میں الزام ان کو دیتا تھا ، قصور اپنا نکل آیا

میں نے اخبارات میں اسلامی سوشلزم کی تائید میں سٹیٹ بنک کے گورنر مسٹر حسنی کی تقریر پڑھی ، انھوں نے کہا ہے :

” یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ اسلامی سوشلزم نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ، جو لوگ یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں ، انھوں نے تاریخ سے وجدان حاصل نہیں کیا “۔ میں مسٹر حسنی کی بڑی عزت کرتا ہوں ، اس لیے نہیں کہ وہ سٹیٹ بنک کے گورنر ہیں ، بلکہ اس لیے کہ مسٹر حسنی نے بطور ایک مسلمان ، اسلام کے ساتھ والہانہ محبت کا اکثر مظاہرہ کیا ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ان کا عشق صادق دیکھ کر میرے دل میں بھی جوش اور ولولہ پیدا ہوا ہے ۔

شام کے ایک اخبار مورخہ ۹ جولائی کا اداریہ دیکھ کر مجھے رنج پہنچا ۔ اداریے کا عنوان ہے : ”مسٹر حسنی کی جانب سے سوشلزم کی حمایت“۔ میں جانتا ہوں کہ مسٹر حسنی سوشلزم کو نوع انسانی کے تمام امراض کا علاج نہیں سمجھتے کیونکہ انھوں نے سوشلزم کی نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم کی حمایت کی ہے ۔ تاہم اس اخبار نے مسٹر حسنی سے جو سلوک کیا ہے اس سے میرے اندیشوں کی تائید ہوتی ہے جن کا اظہار میں پہلے

ہی کر چکا ہوں ۔ بظاہر مسٹر حسنی اسلامی سوشلزم کی حمایت پر اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ انھوں نے تاریخ سے وجدان حاصل کیا ہے اور ممکن ہے وہ اپنی جگہ درست ہوں لیکن میں یہاں نظیری کی تقلید کروں گا اور پیغمبر اسلام کی سیرت مقدسہ سے وجدان حاصل کروں گا :

ہر کجا راہ دہد اسپ براں تاز کہ ما
بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

لاہور کے ایک اردو روزنامے میں مسٹر عبداللہ حُر نے ایک مقالہ لکھتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال ، قائداعظم محمد علی جناح اور صدر ایوب نے اسلامی سوشلزم کی حمایت کی ہے ۔ میں اقبال کا ایک حقیر طالب علم رہا ہوں لیکن میں نے اقبال کو اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہیں نہیں دیکھا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نہایت شد و مد سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور سوشلزم کے ساتھ احترام برتا ہے لیکن اسلام اور سوشلزم کے امتزاج کی تائید انھوں نے کبھی نہیں کی ۔

اقبال اسلام کے ایک بطل جلیل تھے اور اس کے عظیم شیدائیوں میں سے تھے ۔ ان کے نزدیک مثالی طریق زندگی ، اسلام اور محض اسلام تھا ۔ اسلام کا سوشلزم سے موازنہ کرتے ہوئے ، کم سے کم ایک موقع پر " ابلیس کی مجلس شوریٰ " میں انھوں نے واضح طور پر اسلام اور سوشلزم کا فرق بیان کیا ہے ، جب کہ ابلیس اپنے پیروکاروں سے کہتا ہے کہ سوشلزم سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ، البتہ اسلام شیطانی حکمت عملی کے خلاف سب سے بڑا خطرہ ہے :

" مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے "

اسلامی سوشلزم کے بارے میں قائداعظم اور صدر ایوب کے بیانات سے میں واقف ہوں ۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے یہ اصطلاح ، خاصے عرصے تک عام طور پر استعمال ہوتی رہی ہے اور قائداعظم اور صدر ایوب جیسی شخصیتوں نے اسے سماجی انصاف کے اسلامی نظریے کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے ۔ جیسا کہ میں نے پہلے گزارش کی ہے اگر علماء کی اکثریت اس اصطلاح کے استعمال کی اجازت دیتی ہے تو میں نے اپنی تقریر میں جو تاثر دیا ہے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔ اس کے برعکس اگر یہ طے

پاتا ہے کہ اس اصطلاح کا استعمال پسندیدہ نہیں تو اسے ترک کر دینے سے صدر ایوب جیسی شخصیت کے بیانات کے معنی و مقاصد تبدیل نہیں ہو جاتے ۔ صدر ایوب تو خود بھی اسلام کے زبردست حامی ہیں اور پاکستان میں صحیح معنوں میں ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل نو کے لیے انتھک جدوجہد کر رہے ہیں ۔

مضمون

اسلام اور اسلامی سوشلزم

حقیقت خرافات میں کھو گئی

غلام رسول مہر

ہفت روزہ چٹان لاہور ، ۲۲ اگست ۱۹۶۶ء

اسلام اور ” اسلامی سوشلزم “ کے متعلق جو بحث چھڑ گئی ہے اس کی طرف میں نے ایک مضمون میں سرسری اشارہ کیا تھا ۔ میں اس پر طویل گفتگو کا خواہاں نہ تھا کیونکہ طویل بحثیں حقائق کی توضیح کے لیے عموماً مفید نہیں ہوتیں ۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے بھی مفصل بحث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ہمارا ماحول مختلف اسباب کی بناء پر ایسی تفصیلی بات چیت کے لیے موزوں نہیں رہا ۔ زیادہ تر لوگوں کے افکار مذہب نہیں بلکہ باہر سے آئی ہوئی تعلیمات و اصطلاحات کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں اور وہ انھی افکار کی روشنی میں مذہبی حقائق پر نظر ڈالتے ہیں ۔ جو چیز بادی النظر میں ان کے مخصوص افکار کے معیار پر پوری اتر آئے اسے قبول کر لیتے ہیں اور جو نہ اُترے اُس کے باب میں سوءِ ظن شروع ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا ابتدائی مباحث میں عام حقائقِ حیات ہی پیش نظر رکھ لینا مناسب ہے ۔ البتہ اس مرحلے سے بخیر و عافیت گزر جانے کے بعد وہ سب کچھ آنا چاہیے جو ہمیں مذہب حقہ اسلام نے عطا کیا ، جسے قرآن حکیم نے ” اکمال الدین “ اور ” اتمام نعمت “ سے تعبیر کیا ہے ۔

مروجہ نظام

میں سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس بزرگ نے بھی

یہ بحث چھیڑی اسے یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام رائج ہے اور ہم اس پر رفتہ رفتہ کاربند ہو رہے ہیں لہذا کوئی دوسرا سوال اٹھانے یا کوئی نئی اصطلاح استعمال کرنے کی حاجت نہیں اگرچہ وہ اسلام سے مقید ہو ۔ ہمارے ہاں جو نظام چلا آ رہا ہے وہ تو وہی ہے جو انگریزوں بلکہ ان سے بھی پیشتر کے زمانے میں رائج تھا ۔ اگر اس میں تبدیلیاں ہوئی بھی ہوں تو ان کی حیثیت محض جزوی ہے ۔ عوام اور اس طبقے کے درمیان ، جو اجزائے حکومت یا دوسرے فارغ البال عناصر پر مشتمل ہے ، فرق و امتیاز زیادہ نہیں ہؤا تو کم بھی نہیں ہؤا ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس فرق و امتیاز کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی یا اس کے لیے کوئی جذبہ و آرزو موجود نہیں ؛ صرف عملی نتائج کا ذکر کر رہا ہوں ، وہ حسب مراد نہیں نکلے ۔ کیا ” اسلامی سوشلزم “ یا کسی دوسری اصطلاح کی مذمت سے اس اصل مقصود کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے یا پہنچا ؟

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جس نظام کو چلانے والے مسلمان ہوں وہ بہر حال اسلامی ہی ہوگا ۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ گذشتہ چودہ سو سال میں کم از کم اسلامی دنیا کے اندر غیر اسلامی نظام کبھی نہیں آیا ۔ کیونکہ ہر نظام کے چلانے والے مسلمان تھے ۔ لیکن کوئی نظام اپنے کار فرماؤں کی بناء پر نہیں بلکہ اصول و اساسات اور ان کے مطابق عمل پیرائی ہی کی بنا پر اسلامی بنتا ہے اور اس بنیادی حقیقت کے اثبات پر طول کلام غیر ضروری ہے ۔

ادعا نہیں عمل

بہتر ہوتا یہ بحث چھیڑنے والے بزرگ نظام کا ایک ایک پہلو لے کر ثابت کرتے کہ گزشتہ انیس سال میں اس حد تک ہم اسلام کے مطابق آ چکے ہیں لہذا نئی اصطلاحوں کے استعمال کی قطعاً ضرورت نہیں ۔ لیکن انھوں نے ” اسلامی سوشلزم “ کی مذمت شروع کر دی اور یہ بھی نہ سوچا کہ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے ؟ پھر جن اصحاب نے ان کے جوشِ مذمت کو مروجہ نظام کی حمایت قرار دیا ، جو یقیناً سرمایہ داری پر مبنی ہے ، تو کیا وہ حق بجانب نہ تھے ؟ ایسے نظام کی حمایت کے لیے اسلام میں کونسی وجہ جواز موجود ہو سکتی ہے جو

اسلامی اخوت و مساوات کی روح سے کاملاً خالی ہے ؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کی طرح اخوت و مساوات کی بھی شب و روز پکار سے کچھ نہیں بن سکتا ۔ الفاظ اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے دوسروں تک انسان کا مافی‌الضمیر پہنچ جائے ، اس لیے نہیں ہوتے کہ انہیں بار بار بول کر دوسروں کو خوش کیا جائے اور ان کے حقیقی مفہوم کو لباس عمل پہنانے پر قطعاً توجہ کی جائے ۔

اسلامی سوشلزم کا مفہوم

جن اصحاب نے ” اسلامی سوشلزم “ کی اصطلاح استعمال کی ان میں قائداعظم مرحوم بھی تھے ۔ اسلام پر ان کا عقیدہ بے شائبہ ریب پختہ تھا اور وہ مسلمانوں کو اسلام ہی کا عملی نمونہ بنا دینے کے لیے مضطرب تھے ۔ کیا یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ انہوں نے اسلامی اخوت و مساوات کا پہلو ابھارنے اور اسے نمایاں کرنے کی غرض سے یہ اصطلاح استعمال کی ، ورنہ اسلامی کی قید کیوں لگاتے ؟ تنہا سوشلزم کیوں نہ کہہ دیتے ؟ یقیناً ان کی خواہش ہوگی کہ جو نظام پیش نظر ہے اس کی بنیادی حیثیت عوام اور کارفرماؤں کے سامنے رہنی چاہیے ۔ انسان تحمل و بردباری اور غور و فکر سے کام لے تو حقیقتوں کا اندازہ کر سکتا ہے ۔ بے صبری کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ ہنگامے کا سروسامان کر لیا جائے ۔

اسلام کے عملی بُعد کی ایک بنیاد

کیا مروجہ نظام اسلامی ہے کہ اسلامی سوشلزم کا لفظ سنتے ہی گفتار و نگارش میں بجلیاں کوندنے لگیں ؟ آپ کو اس امر پر غصہ کیوں نہ آیا کہ اتنی طویل مدت میں ہم مبادی کا انتظام بھی نہ کر سکے ۔ اور وہی حالت فی‌الجملہ موجود ہے جس سے سفر کی ابتدا ہوئی تھی ؟ پھر کیا آپ نے سوچا کہ اگر اصل نظام کو ہر لحاظ سے اسلامی نہ بنایا جائے گا اور عوام کے لیے اطمینان کامل کا سامان بہم نہ پہنچے گا تو نتیجہ کیا ہو گا ؟ کیا کبھی غور فرمائیں گے کہ مسلمانوں میں عملی اور اعتقادی لحاظ سے جو افسردگی ، فرو مائیگی اور اک گونہ بے حسی پیدا ہو رہی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ اسلام کا جو تصور اول وقت سے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرجع چلا آتا ہے اسے پورا کرنے کے لیے کوئی

حقیقی ، موثر اور واضح قدم اب تک ہم نہیں اٹھا سکے ؟ عرفی کیا خوب کہہ گیا ہے :

گلوئے تشنہ بہ دریا رساندنی دارد
تمام عمر فریب سراب نتواں خورد

یعنی پیاسے کو کسی نہ کسی وقت دریا پر پہنچانا اور پانی پلا دینا ضروری ہے ، وہ عمر بھر سراب کا فریب نہیں کھا سکتا ؛ یہ فریب قائم رکھنے کے لیے بھی پیاسے کو پانی پلائے بغیر چارہ نہیں کیونکہ چیزیں اضداد سے پہچانی جاتی ہیں ۔ پانی کی ضد سراب یا آگ ، حرارت کی ضد برودت ، زندگی کی ضد موت ۔

حقیقی معیارِ قبول کیا ہے ؟

یہ حقیقت ہر شخص پر آشکارا ہے کہ جو نظام عوام کے لیے ہر اعتبار سے مفید و نافع ہوگا اس پر سب جانیں دیں گے ۔ ایک غیر نافع نظام پر کسی مقدس نام کا ٹھپا لگا کر آپ اسے ہر دلعزیز نہیں بنا سکتے بلکہ اس مقدس نام کی قدر و منزلت گھٹائیں گے اور اسے عوام کی نظروں میں بھی کم وقعت بنائیں گے ۔ ہر مسلمان طبعاً اسلام ہی کو دنیا کی عزیز ترین متاع سمجھتا ہے ۔ پھر اس قوم کے بارے میں کوئی کیونکر مبتلائے سوءِظن ہو سکتا ہے جس نے اسلام اور آزادی کی خاطر آگ اور خون کے دریا میں شناوری قبول کر لی اور ہمت نہ ہاری ۔ مگر جس متاع عزیز کے لیے قربانیاں کی تھیں اس کی برکات و حسنات سے وہ دیر تک بہرہ مند نہیں ہو سکی ۔ اسلام ایک منظم و محکم اور مکمل مرقعِ اعمال ہے جس کی تمام برکات و حسنات اس نظام کے مطابق پر خلوص کاربندی ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں ۔ اگر پیاسا " پانی پانی " کہہ کر اور بھوکا " روٹی روٹی " کی صدا لگا کر پیاس اور بھوک نہیں مٹا سکتا تو محض " اسلام اسلام " کہتے رہنے سے اس کی برکتیں کیونکر ہاتھ آ جائیں گی ؟

کمیونزم اور سوشلزم کی حدیں

یہ بھی معلوم ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم (نہ کہ اسلامی سوشلزم) خاص وضع کے اقتصادی نظام میں نہ کسی دین کے مخالف ہیں اور نہ موافق ۔ کسی خاص اقتصادی نظام کو دین سے براہ راست کوئی واسطہ

ہوتا بھی نہیں ۔ چین میں کمیونسٹ نظام جاری ہے ، ہمارے ساتھ اس ملک کے دوستانہ روابط ہیں ، وہاں پانچ چھ کروڑ مسلمان بستے ہیں ۔ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارے یہ بھائی خدا نخواستہ اب مسلمان نہیں رہے ؟ روس کے ساتھ ہمارے دوستانہ روابط قائم ہیں ، وہاں بھی کروڑوں مسلمان رہتے ہیں جو چالیس سال سے کمیونزم کے تابع ہیں ، کیا ان مسلمانوں نے معاذاللہ مذہب کو پس پشت ڈال دیا ہے ۔

عوامی فلاح و بہبود کی برتری

'' اسلامی سوشلزم '' کی اصطلاح استعمال کرنے والوں کا مقصد یہی تھا کہ ہمارا اقتصادی نظام بالائی طبقے نہیں بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کو ہر شے پر مقدم رکھے گا اور وہ ہر اعتبار سے اسلامی نظام ہوگا ۔ کیا یہ سمجھا جائے کہ اس سر زمین میں ، جو عوام کی قوت و حمایت کے بل پر حاصل کی گئی ، عوام کی فلاح و بہبود ہر مصلحت پر مقدم نہ رہنی چاہیے ؟ اگر خدانخواستہ حقیقت یہی ہے تو یہ اس فرسودہ و بوسیدہ نظام کی مذبوحی حرکت ہے جس کے لیے قیام اور جماؤ کی کوئی بھی گنجائش نہیں رہی ۔ یہ وہی دور ہے جس کے متعلق حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا :

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اسلامی مواخات

قرآن مجید کا ارشاد ہے انماالمومنون اخوہ ، مومن بھائی بھائی ہیں ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب کہیں مسلمانوں کا اجتماع ہو یا مسجد میں خطبہ پڑھا جائے تو کہہ دیا جائے ۔ بے شک مسلمان بھائی بھائی ہیں ۔ اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہیے جیسا بھائی بھائی سے کرتا ہے ۔ لیکن ذرا غور فرمائیے کہ یہاں کی دس کروڑ آبادی میں کتنے افراد ہیں جو اس اخوت کی سچی تڑپ دلوں میں رکھتے ہیں ؟ نیز کیا موجودہ نظام میں مواخات کو تقویت پہنچانے کا کوئی وسیلہ مہیا ہے ؟ کیا ہم میں وہ مساوات موجود ہے جو اخوت کی پہلی منزل ہے ؟ اگر ہر مسلمان اپنے ہر بھائی کے لیے حقیقتاً تڑپتا نہیں ، اس کی مشکلات سے متاثر نہیں ہوتا ، ان سب کے طریق بود

و ماند میں اک گونہ مناسبت بھی نظر نہیں آتی تو یہ مواخات کیونکر پنپے گی اور کیونکر پروان چڑھے گی ؟ اگر اس کی تقویت و ترقی کا موثر انتظام نہ ہوگا تو قوم میں وہ وحدت و یکجہتی کیونکر پیدا ہوگی جو بیشتر دکھوں اور دردوں کا واحد علاج ہے ؟ یقیناً ہم سب انماالمومنون اخوہ کے علاج سے محروم ہیں اور ہمارے عام اوضاع و اطوار کو اس پر سچے اور پختہ ایمان سے کوئی مناسبت نہیں ۔

ہمارے افسوسناک اوضاع

میں مواخات کے ذکر میں ان تصویروں کے قصے پر متوجہ نہیں ہونا چاہتا جو اخباروں میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہتی ہیں ، مثلاً چند محترم خواتین یا چند محترم حضرات کسی خاص تقریب کے سلسلے میں کھانے کی چند دیگیں پکوا کر یا پارچوں کے چند گٹھے لیکر مصیبت زدہ بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کرتے دکھائے جاتے ہیں ۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ہم میں سے کوئی اپنے کسی عزیز و قریب پر آفات زدگی کے عالم میں بخشش و نوازش کا وہ طریقہ اختیار کرے گا جو ہم نے بے تکلف اپنے عام مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے متعلق اختیار کر رکھا ہے ! اسلام نے تو خیرات و صدقات میں بھی حتی‌الامکان اخفا پر زور دیا ہے اور ہمارے مصیبت رسیدہ بھائی تو ” خیرات “ نہیں لیتے نہ افراد سے اور نہ حکومت سے بلکہ اپنا ” حق “ لیتے ہیں جو اللہ نے اور اس کے فرمان کے مطابق رسول پاک صلعم نے مقرر فرما دیا ہے ۔ وہ سب اس ملک کے طبعی وسائل میں حصہ‌دار ہیں اور حکومت یا افراد حکومت ان وسائل کے مالک نہیں ، صرف امین ہیں ۔ افسوس کہ ہماری نفس پروری اور حرص، تعلی و ترفع نے ایسے پاکیزہ افعال کو بھی آلودہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔ میں نے تو جب کبھی ایسی تصویریں دیکھیں ہمیشہ متالم ہؤا کہ آیا اس طرح ہم مساوات و اخوت کو تقویت پہنچا رہے ہیں یا اپنے بھائیوں کی تذلیل پر اپنی رفعت کی عمارتیں استوار کر رہے ہیں ؟

زرعی اصلاحات کی مثال

پھر اس سلسلے میں بعض حقائق خاص توجہ کے محتاج ہیں مثلاً ہمارے ہاں ١٩٥٨ء کے بعد ایک بڑا کام وہ ہؤا تھا جس نے ” زرعی

اصلاحات " کے نام سے شہرت پائی اور اب بھی اس کا ذکر ہمیشہ مدح و ستائش ہی سے ہوتا ہے ۔ اس کے مطابق زرعی زمینوں کا ایک حصہ مقرر کر کے فالتو زمینیں مختلف بڑے زمینداروں سے حکومت نے لے لی تھیں تاکہ ان کاشتکاروں میں تقسیم کر دی جائیں جن کے پاس زمینیں بالکل نہ تھیں یا بہت کم تھیں ۔ مالکان اراضی کو ان املاک کی قیمت مقرر کر کے وثیقے دے دیے گئے تھے جو مقررہ حد سے زائد ہونے کے باعث لے لی گئی تھیں ۔ جن صاحب نے اسلامی سوشلزم کی مذمت میں جوش و خروش سے حصہ لیا وہ فرمائیں کہ اس اقدام کی بنا کیا تھی ۔ میرے نزدیک اس کی بنا محض یہ تھی کہ زرعی املاک میں توازن پیدا کیا جائے ۔ اس توازن کا مقصد و مدعا محض یہ تھا کہ ان لوگوں کے لیے اطمینان و دلجمعی کی صورت پیدا ہو جن کے پاس زرعی وسائل معاش کم ہیں یا بالکل نہیں ۔ مجھے صحیح اعداد معلوم نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ توازن کا معاملہ ابھی تک مزید توجہ کا محتاج ہے ، زرعی وسائل میں بھی اور معاش کے دوسرے دائروں میں بھی ۔ اسی سلسلے میں نئی زمینیں آباد کی جا رہی ہیں اور آبیاری کے وسائل کو ترقی دی جا رہی ہے ۔ عین ممکن ہے کل توازن کا تقاضا یہ ہو کہ زرعی املاک میں مزید کمی کی جائے کیونکہ پانسو ایکڑ آبی یا ایک ہزار ایکڑ تابی کا پیمانہ کسی شرعی اصل پر مبنی نہیں ۔ اسی طرح توازن کا تقاضا دوسرے دوائر میں بھی پہنچ سکتا ہے ۔ مثلاً کارخانے ، فرمیں ، عمارتیں وغیرہ ، آیا توازن کی طرف یہ پہلا قدم عوامی فلاح کی بنیادی اصل پر مبنی نہیں ؟ کیا اس سلسلے میں حسب ضرورت مزید قدم اٹھانا ممنوع ہے ؟ اس ایک سوال کے جواب پر " اسلام " اور " اسلامی سوشلزم " کی پوری بحث کا فیصلہ چند لمحوں میں ہو سکتا ہے بلکہ سوشلزم کے باب میں بھی آپ بہتر غور و فکر کے اہل بن سکتے ہیں ۔

وسائل ملک میں حصہ داری

ایک سوال اور : ۔ دنیا میں سینکڑوں ملک ہیں ، ہر ایک کی مقررہ اور معین حدیں ہیں ، آپ سوچیں اور فرمائیں کہ ان حدوں کے اندر رہنے والے بندگان خدا کے انفرادی حقوق کا فیصلہ کس بنا پر کیا جا سکتا ہے ؟ انسان ہونے کے اعتبار سے وہ سب برابر ہیں اور کوئی بھی خدا کی طرف

سے خاص حقوق و اختیارات کا پروانہ لے کر نہیں آتا ۔ ضرورت مندی کا فیصلہ ہر کنبے کے افراد کی تعداد پر موقوف رہنا چاہیے ۔ ہمارے ہاں جو نظام پہلے سے رائج چلا آتا ہے ، اس میں مختلف افراد مختلف اوصاف و خصائص یا مختلف وسائل و تدابیر یا ارباب اقتدار تک رسائی کی بدولت مختلف درجے حاصل کر لیتے رہے ۔ بعض خاصے دولت مند ہو گئے ، اکثر غریب و محتاج رہ گئے ۔ آپ سوچیں اور فرمائیں کہ اس بارے میں اسلام کا فیصلہ کیا ہے ؟ حکمران طبقہ عوام کی طرف سے امین ہے ، اگر اس طبقے میں سے کوئی فرد حدود امانت سے تجاوز کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس اصل کو کاٹتا اور اس بنیاد کو منہدم کرتا ہے جس پر اس کے منصب کا انحصار ہے ، خدا نے کسی ملک کے کسی طبقے کے لیے وسائل میں مساوات ، حصہ داری پر کوئی قید یا پابندی لگائی ہے تو اس کا پتا دیجیے ۔ اس اصل پر غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جو بحث چھیڑی گئی ، وہ بالکل بے بنیاد ہے ۔

اصل مقصود

ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ جس نظام کے داعی ہیں اور تعبیر کے اعتبار سے بھی اس میں کسی اختلاط و آمیزش کے روادار نہیں ، اسے جلد از جلد بروئے کار لائیے ، کم از کم ان اوضاع و اطوار کو تو مٹائیے جو سراسر غیر اسلامی اور سابق غیر مسلم حکمرانوں کی باقیات سئیات میں شامل ہیں جنھیں دیکھتے ہی سلیم‌الحواس انسان پکار اٹھتا ہے کہ یہ بدیہی اسراف بلکہ تبزیر میں شامل ہیں ۔ اسلام شرف انسانی کی بحالی کے لیے آیا تھا ۔ مطلب یہ نہیں کہ شرف کوئی تخت تھا جس پر انسانوں کو بٹھا دینا مقصود تھا ، مطلب یہ ہے کہ ہر انسان عقائد ، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے رفعت ، بلندی ، محبوبیت اور جاذبیت کا پیکر بن جائے ، اس کا وجود عملاً شرف و برتری کا پیکر ہو ۔ ہم جو مناظر دیکھتے رہے ہیں ان میں تو شرف و برتری ہی نہیں بلکہ انسانیت کا سراغ لگانا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے ۔ میں نہ کسی کا مخالف ہوں ، نہ حریف ، میں تو اسلامیت کا ایک حقیر و ناچیز داعی ہوں ، جسے کسی منصب ، کسی عزیزداری ، کسی اکرام کی کوئی آرزو نہیں ، صرف یہ آرزو ہے کہ جس اسلام کو ہم اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں ، اس کا

کوئی عملی نمونہ سامنے آ جائے:

ہوش دار اے مدعی بشناس گوہر از سفال
لب فرد بندیم اگر مقصود الزام است و بس

مضمون

اسلامک سوشلزم

غلام احمد پرویز

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور، ستمبر ٦٦ء

سوال ـ آج کل ملک میں اسلامی سوشلزم کا چرچا ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں مرکزی اسمبلی میں عبدالکریم سومار صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس سے بحث چل نکلی ـ پھر روزنامہ " مشرق " کی ۲۲ جولائی کی اشاعت میں ان کا اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شائع ہؤا جس میں انہوں نے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی اور کہا کہ ہمیں یہ اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اسلام سوشلزم کے سہاروں کا محتاج نہیں ـ انہوں نے علماء سے کہا ہے کہ تحقیق کرکے بتائیں ـ کہ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح مسلمانوں کے استعمال میں کب اور کس طرح آئی ـ کیا آپ اس اہم سوال پر کچھ روشنی ڈالیں گے ؟

جواب ـ یہ کام تو سومار صاحب نے " علماء " کے سپرد کیا ہے کہ وہ تحقیق کرکے بتائیں کہ مسلمانوں میں اس اصطلاح کا استعمال کب سے اور کیونکر ہؤا، اس لیے ہم عامی اس باب میں لب کشائی نہیں کر سکتے ـ لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، ہمیں اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان کے وزیر اعظم، محترم لیاقت علی خان (مرحوم) امریکہ تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں یہ کہا کہ پاکستان کا نظام، اسلامک سوشلزم پر مبنی ہوگا؛ اور اسلامک سوشلزم وہ نظام حیات ہے، جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی ـ انہوں نے یہ بیان تو دیا، لیکن نہ وہاں، اور نہ یہاں اپنی واپسی پر آ کر ہی، یہ بتایا کہ اسلامک سوشلزم سے ہماری مراد کیا ہے، اور اسلام کے اس نظام حیات کے خط و خال کیا ہیں جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی ـ اہل امریکہ کو لامحالہ اس کی

تشویش ہوئی ہوگی کہ متعین طور پر معلوم ہو سکے کہ پاکستان کا معاشی نظام کس قسم کا ہوگا اور اس '' مداری کے تھیلے میں '' بالآخر ہے کیا ۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد (وسط ۱۹۵۱ء میں) امریکن سینٹ کے کچھ نمائندے پاکستان آئے اور انہوں نے کراچی کی ایک تقریب میں براہ راست دریافت کیا کہ :

> ہم اسلامک سوشلزم کے متعلق بہت کچھ سنتے چلے آ رہے ہیں ۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامک سوشلزم کیا ہے اور سوشلزم کے عام تصور میں اور اسلامک سوشلزم میں کیا فرق ہے ۔ نیز یہ کہ کیا اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار (PRIVATE ENTERPRISE) کی اجازت ہوگی ؟

اس سوال کا جواب ، اس تقریب میں سب سے پہلے محترم الطاف حسین صاحب ، مدیر جریدہ '' ڈان '' (حال وزیر مملکت پاکستان) نے دیا جس میں انہوں نے کہا کہ :

> چونکہ پاکستان میں ابھی اسلامک سوشلزم کی جزئیات مرتب ہو رہی ہیں اس لیے اس موضوع پر سر دست تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی ۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسلامک سوشلزم اور عام سوشلزم میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں انفرادی کاروبار کی تو اجازت ہوگی لیکن اس کا منافع غیر محدود طور پر افراد کے پاس نہیں جا سکے گا ، اس منافع میں جمہور کا بھی حصہ ہوگا ۔ پاکستان اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ سوشلزم اور انفرادی کاروبار میں امتزاج پیدا کر سکے ۔

الطاف حسین صاحب کے بعد ، ایک دوسرے صاحب (مسٹر سرور حسن) اٹھے اور انہوں نے کہا کہ اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار کی اجازت ہوگی لیکن دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں جمع نہیں ہونے دیا جائے گا ۔

اس کے بعد ، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم اس نظام زندگی کا نام ہے جس میں ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہوں گے ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس ضمن میں پاکستان نے جو قدم اٹھائے ہیں ان میں وہ شش سالہ قومی منصوبہ شامل ہے جس کا مقصد عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور ملک کی اقتصادیات میں توازن پیدا کرنا ہے ۔

ان جوابات کو سن کر وہ امریکی نمائندے (غالباً) مطمئن واپس چلے گئے کہ خیر—اس میں خطرے کی بات کوئی نہیں ، یہ اصطلاح یا تو محض بطور فیشن اختیار کی گئی ہے اور یا ہمیں ڈرانے کے لیے ، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ان کے—'' طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی ۔ ''

طلوع اسلام نے اُسی وقت اس کا تعاقب کیا اور ان بزرگوں سے کہا کہ خدا کے لیے اسلام کی حالت پر رحم کیجیے ۔ اس کے ساتھ اس قسم کے کھیل نہ کھیلیے ۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنے ہاں یہ متعین کیجیے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور پھر دنیا کو بتائیے کہ پاکستان میں یہ معاشی نظام رائج ہوگا ۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے طلوع اسلام ، بابت ستمبر ۱۹۵۱ء)

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ لندن اور کراچی کے درمیان ایک نہایت دلچسپ مذاکرے کی طرح ڈالی گئی ۔ یعنی ٹیلیفون پر مذاکرہ—اس مذاکرے کی ابتداء ، مغرب کے مشہور مؤرخ ، پروفیسر ٹوئن بی کی طرف سے ہوئی ۔ فریق مقابل تھے چودھری محمد ظفر اللہ خان صاحب (جو اُس زمانے میں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے) ۔ پروفیسر مذکور نے مذاکرے کے شروع میں کہا کہ :

> اسلام ، ان روایات کا حامل ہے جو اس پُر آشوب زمانے میں دنیا کی مشکلات کے حل کے سلسلے میں بہت کچھ پیش کر سکتی ہیں ۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ آج دنیا جن مشکلات سے گذر رہی ہے ان میں اقتصادی مسئلے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اقتصادی مسئلے کی اصل و بنیاد ، کاشتکاری کا مسئلہ ہے (یعنی زمینداروں اور کاشتکاروں کا مسئلہ) ۔ پاکستان جو اسلامی مملکت ہونے کا مدعی ہے ، اس مسئلے کا کیا حل پیش کر سکتا ہے ؟

سوال کی اہمیت کا آپ نے اندازہ کر لیا ۔ اب چودھری صاحب کا جواب سنیے ۔ انھوں نے فرمایا کہ :

> ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم بنائی ہے جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا ؛ اور انڈسٹری اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لیے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں ۔ سندھ اور پنجاب میں ایسی قانونی اصلاحات

نافذ کی ہیں جن سے مزارعین کو مزید رعایات حاصل ہو جائیں گی۔مشرقی پاکستان میں دوامی بندوبست کی لعنت کو دور کر دیا ہے۔

(طلوع اسلام - ستمبر ۱۹۵۱ء، صفحہ ۶۳)

آ گئی آپ کے سامنے اسلامی سوشلزم کی ایک جھلک جس کے متعلق محترم لیاقت علی خان (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی؟

اس کے بعد بھی کبھی کبھی اس اصطلاح کی صدائے باز گشت مختلف اطراف سے سننے میں آتی رہی اور ہم نے ہر موقع پر یہی کہا کہ سوال نئی اصطلاحات وضع کرنے کا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ آپ پہلے متعین کریں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور پھر اس نظام کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ہمارے ارباب بست و کشاد میں سے کسی نے آج تک یہ نہیں کیا۔ ویسے، ان الفاظ کو (بغرض حصول ثواب) سب دہراتے رہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس میں زندگی کے ہر گوشے—سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، عمرانی، دینی، دنیاوی—کے متعلق مکمل اور ابدی قوانین موجود ہیں۔ چنانچہ محترم سومار صاحب کے محولہ بالا مقالے میں بھی کہا گیا ہے کہ:

> سرمایہ داری سوشلزم سے بہتر ہے۔ میں یہ ضرور کہتا ہوں اور اس رائے پر ہمیشہ ثابت قدم رہوں گا۔ لیکن بہترین نظام، اسلامی نظام ہے، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ سوشلزم۔ اسلام ایسا واحد نظام اور واحد نظریہ ہے، واحد فلسفہ اور وہ واحد طرز زندگی ہے جو نوعِ انسانی کو اقتصادی، سماجی، سیاسی اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں فلاح مہیا کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ سوشلزم کی طرف مت دیکھو، سرمایہ داری کی طرف مت دیکھو، ہاں اسلام کی طرف دیکھو* کیونکہ پاکستان کے مسائل اور ساری نوعِ انسانی کے مسائل کا حل اسلام میں ہے۔

---

* اسلام کی طرف دیکھو—اور مسلسل دیکھتے رہو۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (تآنکہ تم قبر تک پہنچ جاؤ)۔

سومار صاحب نے یہ تو کہا ہے لیکن اتنے لمبے چوڑے مقالے میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا جس میں تمام نوعِ انسان کے مسائل کا حل موجود ہے۔۔اسلام سرمایہ داری نہیں۔۔ اسلام سوشلزم نہیں۔پھر اسلام ہے کیا ؟ اس کا بھی کچھ پتا نہیں ! کیا کہنے ہیں اس اسلام کے ؟ ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت میں خدا کے متعلق صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ نیتی ، نیتی ۔ وہ یہ بھی نہیں ، وہ وہ بھی نہیں۔۔وہ ہے کیا ، اس فلسفے میں یہ نہیں بتایا جاتا ۔ یہی حال ہمارے ہاں بچارے اسلام کا ہو گیا ہے ۔ کوئی شخص نیتی نیتی سے آگے نہیں بڑھتا ۔ ان کے ہاں لاالٰہ کی منزل اتنی وسیع ہے کہ اس کے بعد ، اِلااللہ کا کہیں سراغ نہیں ملتا ۔ جن قوموں کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین نہ ہو وہ لا کی منزلوں میں سرگرداں رہتی ہیں ۔ اِلا تک پہنچنا ان کے مقدر میں نہیں ہوتا ۔ ہمارے ہاں بھی لا ہی لا ہے ، اِلا کہیں نہیں ۔ اور اسی وجہ سے روز اس قسم کے الجھاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔

سوشلزم کی اصطلاح آج کل اس قدر عام ہو رہی ہے کہ (''مذہب'' کی طرح) اس کا متعین مفہوم سامنے ہی نہیں آتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کے حامل ، اپنے انسانیت سوز نظام کی وجہ سے بڑے جھینپے جھینپے سے رہتے ہیں اور کہیں کھل کر فخریہ اس کا اعلان نہیں کرتے کہ ہمارا نظام سرمایہ دارانہ ہے ۔ وہ اسے کہیں (FREE ENTER-PRISE) سے تعبیر کرتے ہیں کہیں (LAISSEZ-FAIRE) سے ۔ کہیں اس کا نام (SOCIAL WELFARE) رکھتے ہیں ، کہیں (SOCIAL JUSTICE) ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اس طرح الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر مبتلائے فریب رکھ سکیں گے ۔ ہم نے سوشلزم کا لفظ جب بھی استعمال کیا ہے ، ایک معین معانی میں استعمال کیا ہے اور انھی معانی میں ہم اس وقت بھی اس اصطلاح کو استعمال کریں گے ۔ جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں (اور خود اشاعت زیر نظر میں بھی دوسرے مقام پر اس کا ذکر آیا ہے) مارکس اور لینن نے جس معاشی نظام کا تصور پیش کیا تھا اس کی عبوری شکل کا نام سوشلزم ہے ، اور انتہائی شکل کا نام کمیونزم ۔ لیکن مارکس اور لینن نے صرف ایک معاشی نظام ہی پیش نہیں کیا ۔ انھوں نے وہ فلسفۂ حیات بھی پیش کیا جس پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہونی تھی ۔ یہ فلسفۂ حیات ، مادی جدلیت

(MATERIALISTIC DIALECT) کہلاتا ہے۔ یہ خالص مادہ پرستی ہے جس میں خدا ، وحی ، مستقل اقدار حیات ، آخرت کا انکار ہے۔

علامہ اقبال ، روس کی اس جدید انقلابی تحریک کا غائر نگاہ سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کمیونزم (یا سوشلزم) کا معاشی نظام تو قریب قریب وہی ہے ، جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ حیات ، اسلام کی یکسر نقیض ہے اور کسی مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ نیز انھوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کو بھی محسوس کیا کہ اس قسم کا معاشی نظام صرف اس فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفۂ حیات اس بار گراں کا متحمل ہو نہیں سکتا۔ اس لیے مارکسی کمیونزم دنیا میں کمیاب نہیں ہو سکتی۔ اس نظام کو اگر قرآنی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو پھر یہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں سرفرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں جو اپنا مشہور فارمولا بتایا تھا ، اس سے یہی مفہوم تھا ، وہ فارمولا تھا

بالشوزم + خدا = اسلام

اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ بالشوزم کے معاشی نظام کو اسلام کے فسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو وہ اسلام کے معاشی نظام کے مماثل ہو جاتا ہے۔ اور جب انھوں نے اپنی مشہور نظم (ابلیس کی مجلس شوریٰ) میں ابلیس کی زبان سے یہ کہلوایا تھا کہ :

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے!

تو اس سے بھی ان کی یہی مراد تھی کہ بالشوزم کے معاشی نظام کو اگر مارکسی فلسفے کے تابع رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ نظام چل نہیں سکتا بلکہ اس سے اس قسم کے انسان پیدا نہیں ہو سکتے :

ہو جن کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

یہ صلاحیت صرف اسلامی نظام میں ہے اور اس لیے وہ ہر طاغوتی نظام کے لیے "فتنہ" ہے۔ علامہ اقبال عمر بھر اپنے اس تصور کو عام کرتے رہے۔ وہ تائید کرتے رہے کمیونزم کے معاشی نظام کی (کیونکہ وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے) اور مخالفت کرتے رہے اس کے فلسفۂ حیات کی جو اسلام کے نظریۂ زندگی کی نقیض ہے۔

اب ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ اقبال نے جہاں سرمایہ داری کی

مخالفت کی ہے ، کمیونسٹ ، اس کے ان اقوال کو سوشلزم کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں - اور جہاں اس نے سوشلزم کے فلسفۂ حیات کی مخالفت کی ہے ، سرمایہ داری نظام کے حامی کہہ دیتے ہیں کہ دیکھیے ! اقبال کس طرح سوشلزم کا مخالف ہے !

ہر کسے از بہر خود شد یار من

قائداعظمؒ نے بھی اسلامک سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی تھی - لیکن ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے اسے ، علامہ اقبال کے تتبع میں ، انہی کے فارمولے کے طور پر استعمال کیا تھا - یعنی سوشلزم کا معاشی نظام جسے اسلام کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا جائے - اس لیے کہ وہ نظامِ سرمایہ داری کے سخت مخالف تھے اور پاکستان انہوں نے حاصل ہی اس لیے کیا تھا کہ یہاں اسلامی فلسفۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کی جا سکے -

جہاں تک اس اصطلاح (اسلامک سوشلزم) کا تعلق ہے ، ہمارا خیال یہی ہے کہ ہمیں اس قسم کی اصطلاحات کو اپنے ہاں استعمال نہیں کرنا چاہیے - اس لیے کہ ہر نظام کی اپنی اصطلاح ہوتی ہے اور وہ اصطلاح اسی نظام کے منطوق کے اظہار کے لیے وضع کی جاتی ہے - جب ایک کمیونسٹ ، " سوشلزم " کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد ہوتی ہے وہ معاشی نظام جو مارکس کے فلسفۂ حیات پر متفرع ہے - اس لیے " اسلامی سوشلزم " اجتماعِ ضدین ہے - قرآنِ کریم نے جب ہمیں ایک نظامِ زندگی دیا ہے تو اس نظام کے صحیح صحیح تصور کے اظہار کے لیے اصطلاحات بھی خود ہی تجویز کر دی ہیں - دین ، ایمان ، تقویٰ ، اعمالِ صالح ، صلوٰۃ ، زکوٰۃ وغیرہ اس کی اپنی اصطلاحات ہیں - ان کے مرادفات کسی زبان میں نہیں مل سکتے - اس لیے ان کی جگہ دوسری اصطلاحات استعمال کرنا تو ایک طرف ، ان کا ترجمہ بھی کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا - آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ دین کی جگہ مذہب یا (RELIGION) کی اصطلاح استعمال کرنے سے ، کس طرح اسلام کا پورے کا پورا تصور ہی بدل گیا -

قرآن کریم کے معاشی نظام کا منتہائے نگاہ ربّ العالمینی ہے — یعنی تمام افراد انسانیہ کی طبیعی ضروریات پورا کرنے اور ان کی ذات کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے کی ذمہ داری - اس عظیم ذمہ داری سے

عہدہ برا ہونے کے لیے اس نے معاشی نظام کی اصولی راہ نمائی دی ہے جس میں ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے، ملت کی اجتماعی تحویل میں آ جاتے ہیں اور اس طرح محنت کش کی محنت کو کوئی غصب نہیں کر سکتا ۔ چونکہ اس نظام کی بنیاد قرآن کی مستقل اقدار پر ہوتی ہے جو مختلف افراد کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا جذبۂ محرکہ بنتی ہیں اس لیے اسے کسی غیر قرآنی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ۔ ہم اس کے لیے (رب العالمینی کی جہت سے) نظام ربوبیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ۔ اسی کو قرآنی معاشی نظام (QURANI ECONOMIC SYSTEM) بھی کہہ سکتے ہیں ۔

باقی رہا نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کا تقابل ، تو ہمارے نزدیک اس کی مثال خنزیر کے گوشت اور جھٹکا کیے ہوئے بکرے کے گوشت کی سی ہے ۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں حرام ہیں—لیکن بکرے کو اگر خدا کا نام لے کر ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو جائے گا ، لیکن خنزیر پر ہزار بسم اللہ پڑھیے ، وہ حرام کا حرام ہی رہے گا ۔ سوشلزم کے معاشی نظام کو اسلامی فلسفۂ حیات کے تابع لے آئیے ، وہ حلال و طیب ہو جائے گا ۔

اسے ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ نہ سوشلزم کو مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات سے الگ کرکے اسے ”سوشلزم“ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ، نہ قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام کو ، قرآن کے فلسفۂ حیات سے الگ کرکے اسے اسلامی نظام معاشی کہہ کر پکارا جا سکتا ہے ۔ قرآن کے تصور کی رو سے کسی نظام حیات کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا ۔ اسی لیے اسلام اپنے کسی نظام میں کسی دوسرے نظام کے ساتھ سمجھوتہ (COMPROMISE) نہیں کر سکتا ، کیونکہ سمجھوتہ کرنے میں ، اُس نظام ہی سے سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا ، اس کے فلسفۂ حیات سے بھی سمجھوتہ کیا جائے گا اور یہ شرک ہے ۔

اسلامی نظام کو سوشلزم کہنے سے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ سوشلزم کا مفہوم ، مختلف محرکات کے تابع بدل سکتا ہے ۔ لیکن اسلامی نظام اپنی اصولی ہیئت کے لحاظ سے غیر متبدل ہے ۔ لہذا دین کے تصور کے اعتبار سے بھی ، قرآن کی غیر متبدل اصطلاحات ، تبدیل ہو جانے والی اصطلاحات کے مقابلے میں بہر نوع بہتر ہیں ، بشرطیکہ ان کا مفہوم قرآن سے متعین کرکے ، اسے واضح الفاظ میں سامنے لے آیا جائے ۔

سومار صاحب نے اپنے مقالے میں یہ بھی کہا ہے کہ اس کی بابت "علماء" سے تحقیق کرائی جائے کہ اس "بدعت" کی ابتداء کہاں سے ہوئی تھی؟ اگر علماء سے تحقیق کرانے سے مقصود یہ ہے کہ ان سے فتویٰ حاصل کیا جائے، تو اس کے لیے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے، نہ استفسار کی حاجت۔ ان کے ہاں یہ فتویٰ ہر وقت موجود ہے کہ سرمایہ داری عین اسلام ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ بھوکے کو روٹی ملنی چاہیے وہ ملحد اور مرتد ہے، اسے حوالۂ دار و رسن کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ جس اسلام کے یہ حضرات علمبردار ہیں، وہ اسلام ہمارے دورِ ملوکیت اور جاگیرداری کا پیدا کردہ ہے جس کی تائید کے لیے پہلے غلط روایات وضع کی گئیں اور پھر ان روایات کی بنیادوں پر سرمایہ داری کا قلعہ تعمیر کر لیا گیا جس میں بیٹھ کر یہ حضرات، ہر اُس سینے کو اپنے فتاویٰ کے تیروں سے چھلنی کرتے رہتے ہیں جس میں انہیں اُس قلبِ حساس کی دھڑکن محسوس ہو، جو قاضی ازل کے اس فتویٰ سے لرزاں ہو کہ:

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے! (اقبال)

مضمون

اسلامی سوشلزم

"صدیقی"

ہفت روزہ چٹان لاہور، ۱۲ ستمبر ۶۶ء

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر سب سے زیادہ عجیب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سوشلزم کا تصور مغرب میں پیدا ہؤا، اس لیے یہ ایک غیراسلامی ماحول کا آوردہ تصور ہے جسے قبول کر لینے سے لازماً ان تمام افکار کو بھی تسلیم کرنا ہوگا جو اس تصور سے قریب یا دور کا تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن اگر اس استدلال کو صحیح مان لیا جائے تو ہمیں اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کو بھی رد کرنا ہوگا کیونکہ جمہوریت کا تصور بھی پہلے پہل مغرب میں پیدا ہؤا اور اس کے ساتھ

بھی بعض ایسے افکار پیدا ہوئے جو اسلام سے میل نہیں کھاتے۔ پھر اگر یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی روح اسلام میں موجود ہے اور اسلام جمہوری اقدار کو فروغ دینا چاہتا ہے تو اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشلزم کا تقاضا خود اسلام کے اندر سے ابھرتا ہے کیونکہ اسلام بھی معاشی عدل و مساوات کا بالکل اسی طرح علمبردار ہے جس طرح خود سوشلزم ، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ اصل میں اس بحث کے ایک پہلو کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا ہم سوشلزم کو ایک خالص معاشی نظام کی حیثیت سے قبول کریں یا اس کے ساتھ جو مابعدالطبیعی افکار وابستہ ہیں انھیں بھی اپنائیں۔ یہی سوال جمہوریت کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ جمہوری تحریک نے یورپ میں بہت سے مختلف مابعدالطبیعاتی افکار پیدا کیے ، مثلاً روسو اور لاک وغیرہ کا جو اس تحریک کے بانی تھے ایک مستقل فلسفہ زندگی تھا۔ تو کیا یہ ضروری ہے کہ جمہوریت کو ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے قبول کرنے کے ساتھ ہم روسو اور لاک وغیرہ کا فلسفۂ زندگی بھی ضرور اپنائیں جب کہ یہ فلسفہ اب یورپ میں بھی مقبول نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ سوشلزم کی متعدد اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض ہمارے مذہبی افکار سے متصادم ہوتی ہیں اور بعض مذہب سے کوئی تعرض نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں کرسچین سوشلسٹ بھی ہیں جو عیسائی رہتے ہوئے بھی سوشلزم کے حامی ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ معیشت اور سیاست کے نظام ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں اور اگر یہ نظام اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں تو انھیں محض اس بنا پر رد نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی بیرونی تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ اسلام کو کسی بیرونی تہذیب کے صالح اجزا سے بیر نہیں ، البتہ اس امر میں بحث ہو سکتی ہے کہ کسی غیراسلامی تہذیب کا کوئی خاص عنصر اسلامی نقطۂ نظر سے صالح ہے یا نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں پہلے پہل ایرانی طرز کا دیوان قائم کیا ؛ اس وقت آپ کے اس فعل پر کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ تم یہ غیر اسلامی انتظامی طریق کار کیوں اپنا رہے ہو اور نہ کسی نے یہ کہا کہ اگر تم ایران سے اس کے انتظامی طور طریق اخذ کرو گے تو اس کے باعث ایران کے مذہبی اور اخلاقی افکار و تصورات کو بھی قبول کرنا ہوگا۔

سوشلزم کے خلاف ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اسلام وسائل معیشت کو قومی ملکیت کی تحویل میں دینے کے مخالف ہے لیکن در حقیقت اس کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث سے نہیں دیا جا سکتا ۔ اسلام نے اس کے بارے نفیاً یا اثباتاً کچھ بھی نہیں کہا ہے ؛ اس نے اس بات کو ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے ۔ قرآن و حدیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نجی ملکیت کا مخالف نہیں اور وہ ذاتی ملکیت کے حق کو برقرار رکھتا ہے مگر کمیونزم کے برخلاف سوشلزم کے تحت ذاتی ملکیت کو بالکلیہ منسوخ نہیں کیا جاتا ۔ مثلاً انگلستان میں اس وقت سوشلسٹ نظام قائم ہے لیکن وہاں اس کے ساتھ ساتھ نجی ملکیت کا بھی بڑا وسیع حق دیا گیا ہے ۔ البتہ چند ضروری بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت کی تحویل میں دے دیا گیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ خود ہمارے یہاں ، پاکستان میں ، بعض چیزیں افراد کے ہاتھوں سے لے کر قومی ملکیت کی تحویل میں دے دی گئی ہیں مثلاً ریڈیو ہمارے یہاں قومی ملکیت ہے ، کوئی فرد اپنی طرف سے تجارت یا کسی دوسرے مقصد کے لیے نشرگاہ نہیں قائم کر سکتا ۔ اسی طرح ریلیں (Railways) اور ڈاکخانے بھی ہمارے یہاں قومی ملکیت ہیں ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام قومی ملکیت کا بالکلیہ مخالف ہے انہیں ریڈیو ، ٹیلیفون ، ریلوں اور ڈاکخانوں کو قومی ملکیت میں دینے کی حکمت عملی کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے ۔ اگر وہ اس پالیسی پر متعرض نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک محدود دائرے ہی میں سہی، انھوں نے ملکیت کو قومیانے کی پالیسی کو اصولاً تسلیم کر لیا ہے ۔

درحقیقت جو لوگ اسلامی سوشلزم کی مخالفت میں سب سے زیادہ پیش پیش ہیں وہ پاکستان کے موجودہ معاشی نظام کے جواز کا راستہ تلاش کر رہے ہیں ۔ حالانکہ یہ نظام بھی مغرب کا پروردہ اور آفریدہ ہے ۔ اگر ان لوگوں کو مغربی نظامات و افکار سے واقعی مخاصمت ہوتی تو وہ پاکستان کے موجودہ معاشی نظام کو بدلنے پر ضرور اصرار کرتے ، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ موجودہ نظام سرمایہ داری کے بقاء کے لیے کوشاں ہیں اور سوشلزم کی مخالفت میں اسلام کو ملوث کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ در حقیقت اسلام کے نام پر معاشی

ظلم و استحصال جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایک مکمل اور جامع دین کی حیثیت سے اسلام کا مشن ہی یہ رہا ہے کہ وہ دنیا سے ناانصافیوں اور مظالم کا استیصال کرے اور سوسائٹی کو عادلانہ اصولوں پر منظم کرے۔

اسلامی سوشلزم کے مخالفین یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کا خود ایک مستقل معاشی نظام ہے اس لیے اسے نہ سوشلزم کی ضرورت ہے اور نہ سرمایہ داری کی ، لیکن ابھی تک کسی مفکر نے اسلامی معاشی نظام کی تفصیلات پر روشنی نہیں ڈالی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ واقعی اسلام کا اپنا ایک مستقل معاشی نظام ہے۔ اس سلسلے میں ایک اسلام پسند انسان کے دل میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام موجودہ نظام سرمایہ‌داری میں صرف جزوی ترمیت چاہتا ہے یا وہ اس میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ اس نظام کو یکسر تبدیل کر کے ایک نیا نظام اس جگہ لانا چاہتا ہے تو اس نئے نظام کے خد و خال کیا ہوں گے ؟ کیا محض سود کی ممانعت اور زکٰوۃ کے نفاذ سے معاشرے کی تمام ناھمواریاں دور ہو جائیں گی اور سوسائٹی میں ویسی ہی مساوات پیدا ہو جائے گی جیسی اسلام قائم کرنا چاہتا ہے ؟ کیا اسلامی نظام کے تحت لوگوں کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا انتظام عمل میں لایا جائے گا ؟ کیا انھیں طبی امداد ، بیروزگاری کے بیمے ، مفت تعلیم اور حکومت کی فراہم کردہ رہائشی سہولتوں سے متمتع ہونے کا موقع حاصل ہوگا ؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو حکومت ان سہولتوں کے لیے وسائل کس طرح فراہم کریگی ، مالداروں پر ٹیکس لگا کر یا بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت کی تحویل میں دے کر ؟ جب تک ان مسائل پر سیر حاصل بحث نہ کی جائے ، لوگوں کو صرف یہ کہہ کر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام ایک جامع اور مکمل نظام ہے ، لہذا تمھیں کچھ سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔

* * *

مضمون

اسلام اور اشتراکیت

محمد صفدر میر

روزنامہ پاکستان ٹائمز ، لاہور، ۵ اگست ۱۹۶۶ء

پاکستان کے مسلمانوں کو جناب عبدالکریم سُومار کا تہ دل سے شکرگزار ہونا چاہیے ، اس لیے کہ انھوں نے ایک ایسے اہم مسئلے پر آزادانہ بحث کا آغاز کیا ہے جو برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں ، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں ، کی زندگی میں ایک بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے - مرکزی طور پر مسئلہ یہ ہے کہ بیرونی سامراج سے رہائی پانے کے بعد ایک مسلمان معاشرہ نئے سرے سے اپنی معاشی تنظیم کس طرح کرے ، نیز کس طرح کی معاشی تنظیم اس امر کی ضمانت دے سکتی ہے کہ اسلام پر قائم رہنے والی ایک قوم اپنے مذہب ، انسانی حقوق ، ثقافت ، معاشی اور سیاسی آزادی اور عزتِ نفس کی حفاظت کر سکے ؟

جناب عبدالکریم سُومار کا ہمیں ممنونِ احسان محض اس وجہ سے نہیں ہونا ہے کہ انھوں نے ایسے اہم مسئلے پر بحث چھیڑی ہے بلکہ بحث کے جس انداز کو انھوں نے اپنایا ہے اُس کے لیے بھی وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں - اُن کے اسلوب سے معقولیت ، فراخیٔ طبع ، صداقت اور حقیقت کی طے تک پہنچنے کی شدید خواہش کا اظہار مترشح ہے - کسی ایسی بحث میں ، جس سے تمام پاکستانیوں کو یکساں طور دلچسپی ہے ، چاہے وہ امیر ہوں یا غریب ، سرمایہ دار ہوں یا اشتراکی ، کسان ہوں ، کارخانوں کے مزدور ہوں یا دانش‌ور حضرات ، اسی قسم کا انداز اور اسلوب کار آمد ہو سکتا ہے - سچی بات تو یہ ہے کہ صداقت اور حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی خواہش کی اس شدت نے جو اُن کے دل میں موجود ہے اُن سے جلدی میں بعض ایسی باتیں کہلوائی ہیں (اُن کی اس تحریر میں جو وسیع پیمانے پر ملک کے اخباروں میں نشر ہوئی ہے) جو وہ نہ کہتے یا اگر کہتے بھی تو مختلف پیرائے میں کہتے ، اگر انھیں مسئلے پر زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ملتا - اس

کے باوجود یہ اسلام اور اسلامی اشتراکیت کے لیے بڑی ہی نیک فال ہے کہ موصوف نے قومی مسائل پر آزادانہ بحث کا دروازہ کھول دیا ہے تاکہ " تجزیے، دلائل، منطق اور معقولیت " سے ان پر غور کیا جا سکے ۔

موصوف نے کہا ہے کہ "اسلامی اشتراکیت بجائے خود ایک خطرناک تصور ہے اور اسلام کے ساتھ فراڈ ہے "۔ مزید یہ کہ " یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب کئی معصوم اشخاص بے سوچے سمجھے کر جاتے ہیں "۔ مزید یہ کہ اسلام اور اشتراکیت " بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ " مزید یہ کہ " میری رائے میں ان دونوں کو یکجا کرنا ناممکن ہے ۔ " مزید یہ کہ " مجھے ڈر ہے کہ یہ اصطلاح (یعنی اسلامی اشتراکیت) بعض مشکوک مقاصد کے تحت گھڑی گئی ہے "۔ مزید یہ کہ " سرمایہ داری اشتراکیت سے بہتر ہے ۔ میں اس بات پر قائم ہوں اور ہمیشہ قائم رہوں گا ۔" مزید یہ کہ " اقبال نے اسلام اور اشتراکیت کے میل کی کبھی حمایت نہیں کی ہے ۔ "

جس طرح سومار صاحب نے مسئلے کو پیش کیا ہے اُس کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت لایا جا سکتا ہے ۔ (۱) اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے سے الگ، بالکل متفرق، اور متضاد دائرے ہیں ۔ لہذا ایک مسلمان اشتراکی نہیں ہو سکتا ، (۲) اسلام ایک مکمل اور ناقابل تغیر " دین " ہے ۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی ۔ لہذا اس کا نظامِ قوانین نہ تبدیل ہو سکتا ہے نہ اس میں ارتقا ممکن ہے ، (۳) وہ لوگ جو اسلامی اشتراکیت کی حمایت کرتے ہیں یا تو ایک معصومانہ غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اسلام اور اشتراکیت دونوں سے ناواقف ہیں یا پھر اور یہ کہ اُن کے مقاصد مشکوک ہیں اور وہ محض اپنے اشتراکی خیالات کو اسلام کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

ضروری ہے کہ آغاز ہی میں ان اصطلاحات کی تعریف کر دی جائے جن کا بحث سے بنیادی تعلق ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ جب ہم " اشتراکیت " اور " سرمایہ داری " جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ہم ان سے کیا مراد لیتے ہیں ۔ تعریفوں کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ سومار صاحب نے یہ تو کہا ہے کہ اسلام کو اشتراکیت اور

سرمایہ‌داری دونوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے سرمایہ داری کے حق میں صاف صاف اپنی خیر سگالی کا اعلان کر دیا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر کہیں اشتراکیت اور سرمایہ داری میں انتخاب کا مسئلہ درپیش ہو تو موصوف، یا اُن کی جگہ کوئی بھی مسلمان، سرمایہ داری کی اقدار کو اپنا سکتا ہے، یا کم از کم، سرمایہ داری کی اقدار کے بارے میں نیک خیال رکھ سکتا ہے لیکن اشتراکیت کی اقدار کو نہ وہ اپنا سکتا ہے، نہ اُن کے بارے میں نیک خیال رکھ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری بحث، تاحال جس طرح سے پاکستان میں ہوئی ہے، اس مفروضے پر مبنی ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان کوئی تصادم یا کش مکش موجود ہے۔ حالانکہ بحث کا اصلی اور حقیقی نکتہ یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشی نظام، یعنی سرمایہ داری، اور مستقبل میں ایک نئے معاشی نظام، یعنی 'اشتراکیت' کے ابھرنے کے امکانات میں باہمی تصادم اور کشمکش ہو رہی ہے۔ یہ ایک عالمگیر تصادم اور کشمکش ہے اس لیے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں عالمگیر حقائق ہیں۔ اس تصادم اور کشمکش پر مفید مطلب بحث بھی ایک عالمگیر تاریخی تناظر ہی میں ہو سکتی ہے، نہ کہ پاکستان میں اشتراکیت اور اسلام کے کسی مفروضہ تصادم اور کشمکش کی روشنی میں۔ اس مؤخرالذکر اور خود ساختہ تصادم کی قبولیت اس مفروضے پر قائم ہے کہ پاکستان کی معاشی تنظیم نہ سرمایہ دارانہ اصولوں پر مبنی ہے اور نہ اشتراکیت کے اصولوں پر بلکہ ایک تیسرے، غیر وضاحت شدہ، معاشی نظام کے اصولوں پر جسے اس کے داعیوں نے "اسلامی نظام" کا مقدس نام دے رکھا ہے؛ اور یہ کہ اس غیر وضاحت شدہ اسلامی نظام کو اشتراکیت کی طرف سے خطرہ ہے جس کا سدِ باب ہونا چاہیے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا معاشی نظام — امریکہ، برطانیہ اور بھارت کی طرح — کلاسیکی سرمایہ داری کے "آزاد تجارت" کے اصول پر قائم ہے۔ اگر آج پاکستان میں اشتراکیت سے کسی نظام کو خطرہ ہے تو وہ اسلام کو نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کو ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت ہمارے مخصوص زمانے میں ایسی سیاسی تحریکوں کے نام بھی ہیں جو ایک دوسرے سے باہم آویزاں ہیں۔ لیکن

اس کے ساتھ ہی ساتھ عالمگیر تاریخی زمانے کے تناظر میں یہ انسانی معاشرے کی مختلف معاشی تنظیموں کے بھی نام ہیں ، اسی طرح پر جیسے عالمگیر تاریخی تناظر میں انسانی معاشرے کے کئی اور نظامہائے معیشت ، ہم سے پہلے متشکل ہو چکے ہیں ، مثلاً یورپ اور ایشیا میں جاگیرداری نظامِ معیشت ، رومن شہنشاہیت ، یونانی شہری ریاست ، قدیم ایرانی اور ہندو شہنشاہیت کا غلامانہ نظام معیشت — اور اس سے بھی پہلے قبلؔ تاریخ کے ادوار میں دنیا بھر کے زراعتی اور گلہ بان قبائل کا قدیم اشتراکی نظام معیشت ۔ یہ سب معاشی نظام — ازمنۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ میں — مخصوص ملکیتی تعلقات کی شکلیں ہیں ۔ معاشی تنظیموں کی حیثیت میں ان کی ماہیئت ہم اس طرح دریافت کرتے ہیں کہ ان کی وساطت سے مختلف انسانی گروہوں نے اپنے اندر ملکیت کے کون سے مخصوص تعلقات پیدا کیے ۔ یہ تمام معاشی نظام وجود میں آئے اور معدوم ہوگئے؛ اسی طرح جدید زمانے میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظامہائے معیشت وجود میں آئے ہیں اور اپنا وقت پورا کر کے یہ بھی معدوم ہو جائیں گے اور زمانہ ان کی جگہ نئے اور ہنوز نامعلوم نظامہائے معیشت کی خبر دے گا ۔

جاگیردارانہ نظامِ معیشت میں ملکیتی تعلقات کی ماہیئت یہ ہے کہ زمین کی ملکیت فوجی سرداروں کی ایک جماعت کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی ہے ۔ اُمراءٔ اور شہزادگان ، بادشاہ اور شہنشاہ ، انفرادی طور پر ، یا من حیث المجموع ، زمین کے مالک ہوتے ہیں ۔ کسانوں اور کسبی کاریگروں کے طبقے تمام دولت پیدا کرتے ہیں جو براہ راست اشراف کے طبقے کی ضروریات کو پورا کرتی ہے ۔ سرمایہ داری نظام معیشت ، اس کے برعکس ، تمام دولت اور پیداوار کو نجی ملکیت میں تبدیل کر دیتی ہے اور دوسری طرف — ایک آزاد تجارتی منڈی کی تنظیم کی وساطت سے، زندگی اور محنت کے ہر مظہر کو ایک جنسِ بازار (Commodity) میں تحلیل کر دیتی ہے ، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ایسا وقت آ جاتا ہے کہ آبادی کی اکثریت دولت کی پیداوار کے تمام وسائل سے محروم ہو جاتی ہے ۔ یہ عمل محض ملکی یا قومی سطح پر نہیں ہوتا بلکہ بین الاقوامی اور عالمگیر سطح پر ہوتا ہے ۔ قومی معیشتیں موجود رہتی ہیں لیکن محض ایک بین الاقوامی معیشت کے کُل کا جُز بن کر جو انقسامِ محنت کو

قومی حیثیت سے بڑھا کر عالمگیر حیثیت میں متشکل کر دیتی ہے - جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اس نظام معیشت کا عالمگیر اور بین الاقوامی کردار زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے ؛ بین الاقوامی سرمایہ داری نظام تمام دنیا کے پیداواری وسائل کا مالک بنتا جاتا ہے ، تمام پیشین جائداد کے مالکوں کو بے دخل کرتا جاتا ہے ، دولت پیدا کرنے والے ایک بین الاقوامی اجتماع کی محنت سے استفادہ کرتا جاتا ہے جو ایک بین الاقوامی محنت کش طبقے — ایک مزدور طبقے — کی حیثیت میں روئی ، پٹ سن ، ربڑ ، کوئلے ، لوہے جیسے خام مواد کی پیداوار میں مصروف رہتا ہے یا کپڑے اور مشینری جیسی مصنوعات کی پیداوار میں - جب یہ حالت عالمگیر ہو چکتی ہے ، تو پھر کسی ملک یا کسی قوم کے لیے ، خواہ انسان ، معاشرے یا خدا کے بارے میں اُن کے تصورات کچھ ہی کیوں نہ ہوں ، اس عالمگیر نظام سے الگ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے - اگر کوئی معاشرہ یا کوئی ملک یا کوئی قوم اپنے آپ کو اس سے الگ رکھنا چاہے تو اس کو طاقت کے بل پر مجبور کیا جاتا ہے کہ اس نظام کا ایک حصہ بن جائے - دو سو سال پہلے اسی قسم کا ایک واقعہ اُس علاقے میں پیش آیا جسے ہم آج مشرقی پاکستان کہتے ہیں ، اور اس کے بعد سارے براعظم پاک و ہند میں یہی عمل دہرایا گیا - اور اسی طرح چین میں پچھلے ایک سو برس میں ہؤا - اس مقام پر سرمایہ داری کو سامراج کہا جاتا ہے -

بہر صورت ، چاہے یہ نظام قومی سطح پر مرتب ہو یا بین الاقوامی سطح پر ، اس کی ماہئیت اس عمل میں ہے کہ یہ ایک طرف سرمایے کو بڑے سے بڑے پیمانے پر مرکوز کرتا ہے اور دوسری طرف محنت کو - ایسے ملکوں میں جہاں یہ عالمگیر نظام قائم ہے ، حقیقی طاقت نہ شہزادگان کے ہاتھ میں ہوتی ہے ، نہ نوابوں کے ہاتھ میں ، نہ بادشاہوں کے ہاتھ میں ، نہ عوام کے ہاتھ میں ؛ ساری سیاسی اور معاشی طاقت کا منبع اور مخرج سرمایہ ہوتا ہے - یہ عجیب و غریب شے ، اپنی کاروباری حیثیت سے ایک غیر شخصی قوت ہے اور اس کے باوجود ہر جگہ اسی کا دور دورہ اور اسی کی حکومت ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا تعین کریں کہ یہ کیا ہے ؟ سرمایے کی تعریف اور تعین کیے بغیر ہم سرمایہ داری اور سوشلزم کے تصادم کو سمجھ نہیں سکتے -

سرمایہ محض روپے پیسے کا نام نہیں ہے ، اقتصادیات کی کوئی بھی ابتدائی کتاب آپ کو اتنا بتا دے گی ۔ سرمایہ دراصل نجی ملکیت کی اس شکل کو کہتے ہیں جو ہمارے موجودہ معاشرے کے نظام معیشت — یعنی سرمایہ داری — کے تحت وجود میں آتی ہے ۔ یہ محض کسی بھی قسم کی دولت کے ارتکاز کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص قسم کی دولت کے ارتکاز کا نام ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ سرمایہ دار خود اس دولت کو پیدا کرتا ہے جو اس کے ہاتھوں میں جمع ہوتی ہے ۔ سرمایے کے تمام مظاہر ، سرمایہ داری ملکیت کی تمام شکلیں — خام مواد ، پیداواری آلات اور ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی جو مزید نئے خام سواد ، نئے پیداواری آلات اور نئی ضروریاتِ زندگی کو ظہور میں لانے کے لیے کام آتی ہیں — محنت سے پیدا ہوتی ہیں ، وہ محنت کی پیداوار ہیں ، مجسم محنت ہیں ۔ یہ مجسم محنت سرمایہ داری نظام میں ایک خود مختار قوت بن جاتی ہے ، معاشرے کے ایک حصے کی دوسرے تمام حصوں پر فوقیت کی حامل ایک قوت میں ڈھل جاتی ہے — اس لیے کہ اس نظام کے تحت یہ معاشرے میں ایک طبقے کی ملکیت ہے ، اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے اور بڑھانے کے لیے اسے ہر وقت نئی زندہ قوتِ محنت سے معاملہ کرنا پڑتا ہے ۔ اسی لیے اس کا وجود اس امر پر منحصر ہے کہ معاشرے میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہو جس کے پاس سوائے اپنی محنت کی قابلیت کے اور کچھ بھی نہ ہو ۔ انقسامِ محنت کی پیچیدگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ دولت کی پیداوار اشتراکِ محنت کا عمل بن چکی ہے ۔ لیکن اس اشتراکِ محنت کا حاصل ایک چھوٹے سے طبقے کی نجی ملکیت ہوکر رہ گیا ہے ۔ اس حقیقت کو آج ہم اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے پاکستان میں سرگرمِ عمل دیکھ رہے ہیں ۔

سرمایے اور محنت کے تعلق میں — جو دراصل ایک جنس کا دوسری جنس کے ساتھ تبادلے کا تعلق ہے — محنت کش اپنی قوتِ محنت کو اُجرت (یعنی مزدوری) کے عوض بیچتا ہے ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک کھرا سودا ہے ۔ اور فریقین کو پوری آزادی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کریں یا نہ کریں ؛ قانون اس آزادی کی تصدیق کرتا ہے ۔ لیکن دراصل ہوتا یہ ہے کہ پیداوار کے عمل کے اختتام پر جب نئی پیدا کی ہوئی جنس کی مجموعی قدرِ تبادلہ میں سے سرمایے کا حصہ جو اس کا حق بنتا ہے (یعنی وہ حصہ جو اس کو مزدوروں کی اُجرت کے علاوہ

مصارفِ پیدائش ، مثلاً مشینوں کی قیمت ، خام مواد کی قیمت ، زمین کا کرایہ وغیرہ کے بدلے میں ملنا چاہیے) جب یہ حصہ نکالا جاتا ہے تو مزدور کا حصہ (یعنی اُجرت) باقی ماندہ قدر کے مساوی نہیں ہوتا بلکہ کم ہوتا ہے۔ اگر یہ باقی ماندہ قدر مزدور کے حصے کے مساوی ہو یعنی اگر مزدور کو افزائشِ پیداوار کے اُس خاص مقام پر جس میں اُس نے حصہ لیا ہے ، شے کی قیمت میں جو بھی اضافہ ہؤا ہے ، وہ سب کی سب مل جائے ، تو سرمایے کے مالک کو فاضل آمدنی حاصل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن فاضل آمدنی ہوتی ہے — جسے منافع کہتے ہیں۔ کوئی صنعت‌کار پیداوار کے عمل میں حصہ لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوگا اگر وہ عمل اس کو اس کے خرچ سے زیادہ ، یعنی اُس کے مصارف پیدائش بمع اُجرت سے زیادہ ، کوئی نفع نہیں دیتا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اُسے اپنی فیکٹری کو بند کرنا پڑے گا کہ اس طرح اُسے خسارہ ہوگا۔ منافع ، یعنی جو فاضل قدر محنت کی وجہ سے جنس میں پیدا ہوئی ہے ، وہی سرمایہ دار کے لیے پیدوار جاری رکھنے کا محرک بنتی ہے۔ یہ منافع جو وہ حاصل کرتا ہے دراصل وہ اضافہ ہے جو مزدور کی قوتِ محنت نے پیداوار کے عمل کے دوران سرمایے میں ایزاد کیا ہے۔ یہ محنت کی فاضل قدر ہے جسے سرمایہ دار نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ قصہ مختصر یہ منافع غصب شدہ مزدوری کا نام ہے۔

دنیا بھر میں جو تضاد اور تصادم پچھلے ایک دو سو برس میں ظہور پذیر ہوئے میں — جنگیں ، معاشی بحران ، بغاوتیں ، انقلاب — سب کے سب محنت کی اس فاضل قدر سے متعلق ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت ، بطور معاشی اور سیاسی نظاموں کے ، ایک دوسرے کے ساتھ اسی مسئلے پر متضاد اور متصادم ہیں — کہ جو فاضل قدر محنت کش ، ایک طبقے کی حیثیت میں ، پیدا کرتے ہیں وہ کس کو ملنی چاہیے ؟ چونکہ فاضل قدر ہر ایک جنس میں — اُس کے آغاز سے لے کر جب وہ خام مواد ہے ، اُس کے انجام تک جب وہ انقسامِ محنت کے مختلف درجوں سے گزر کر صنعتی مال میں تبدیل ہو جاتی ہے — جمع ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ ایک مشترک سماجی پیداوار ہے ، انفرادی پیداوار نہیں ہے ، وہ مشترکہ محنت کا حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی کہتے ہیں کہ جو قدر محنت کش طبقے کے من حیث‌المجموع پیدا کیے ہوئے اس مشترک

حاصل کو سرمایہ داروں کے طبقے کی ملکیت بنا دیتا ہے وہ قانون استحصال کی آزادی کو رواج دیتا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں ڈاکے اور راہزنی کی آزادی کو۔ صرف ایک ہی طریقہ ہے جس سے اس امر کا بندوبست ہو سکتا ہے کہ جو پیداوار اور حاصل سب لوگوں نے اجتماعی اور ساجی طور پر مل کر تخلیق کیا ہے اُسے اُن لوگوں کی بھلائی کی خاطر اجتماعی اور ساجی طور پر ہی استعمال کیا جائے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ وسائل پیداوار مشترکہ طور پر پوری ساج کی ملکیت میں لے لیے جائیں۔ اسی کا نام اشتراکیت ہے۔ اشتراکیت نہ اس سے کچھ کم ہے، نہ زیادہ۔

لیکن سرمایہ دار، جو محنت کی اس فاضل قدر پر اپنی ملکیت قائم رکھنا چاہتا ہے، اس کے بارے میں اور طرح سے سوچتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اجتماعی ملکیت تو نجی ملکیت کے حق اور تجارت کی آزادی کے منافی ہے، اور نجی ملکیت کا حق اور تجارت کی آزادی ازلی ابدی انسانی حقوق اور آزادیوں میں سے ہیں اور خدا کی طرف سے ودیعت ہیں۔ سرمایہ دار کی نظر میں جو شخص یہ رائے رکھے کہ مزدوروں کو اپنی مشترک محنت کے حاصل کو مشترک ملکیت کے طور پر اپنی تحویل میں لینے کا حق ہے وہ انسانی فطرت اور خداوندی قوانین کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نزاع کا مرکزی نقطہ یہی ہے۔ ان دونوں کے متضاد اور متصادم فلسفیانہ، سیاسی اور اخلاقی نقطۂ نظر سب اسی بنیادی مسئلے سے پیدا ہوتے ہیں کہ یہ فاضل قدر جو مشترکہ محنت کا پھل ہے، اور جو سرمایہ داری نظام میں مشترکہ ملکیت نہیں بنتی، اس کا کیا کیا جائے؟

ہم اس مسئلے کو اس کے بنیادی اور اصل الاصولی نکتے کی روشنی میں پرکھیں تو ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ اگر سرمایہ داری اور اشتراکیت میں ہمارے لیے انتخاب کا سوال درپیش ہو تو اسلام — جس طرح اس کی تعلیم ہمیں قرآن میں دی گئی ہے اور جس طرح رسولِ مقبول صلعم اور صحابہؓ کرام کی زندگیوں میں اس پر عمل ہوا ہے — کس کے حق میں فیصلہ دے گا اور اپنی قوت کس فریق کے

حق میں صرف کرے گا۔ ذخیرہ اندوزی ، تاجرانہ فریب کاری ، چوری ، رہزنی ، کم تولنے اور سود کے بارے میں — جو سرمایہ داری نظام میں فاضل قدر محنت یا غصب شدہ مزدوری کی مختلف شکلیں ہیں — قرآن کی تعلیمات اتنی واضح اور عوام الناس میں اس حد تک جانی پہنچانی ہیں کہ ان کی تفصیل میں جانا سعیٔ لا حاصل کے مترادف ہے۔ ہر مسلمان بچہ جو قرآن پڑھا ہؤا ہے اور رسول مقبول صلعم کی زندگی کے حالات سے واقف ہے۔ ان مسائل پر قرآنی تعلیمات سے بخوبی آگاہ ہے۔

لیکن ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم تو جدید معاشی تنظیم کے سلسلے میں بات کر رہے ہیں اور قرآن میں کہیں کوئی ایسا حکم نہیں ملتا جس سے مشترکہ ملکیت کا جواز نکلتا ہو۔ یہ ٹھیک ہے ، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں قرآن میں کوئی ایسا حکم بھی ملتا ہے جس سے مشترکہ ملکیت کی مخالفت کا جواز نکلتا ہو ؟ یا پھر کہیں ایسا حکم دکھائیے جس سے مسلمانوں پر لازم آتا ہو کہ اس قسم کی ملکیت کو دین کا جزو بنائیں جس کی تفصیل سرمایہ داری نظام کے سلسلے میں اوپر دی گئی ہے !

کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کو نجی ملکیت کی آزادی دیتا ہے لیکن اشتراکیوں نے نجی ملکیت یا نجی ملکیت کے حق کے خلاف کب آواز بلند کی ہے ؟

مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے ، یا وہ سرمایہ دارانہ پراپیگنڈے کی مشینری کی وجہ سے اس طرح سوچنے پر مجبور کیے گئے ہیں ، کہ اشتراکیت کا مقصد تمام نجی ملکیت کو منسوخ کرنا ہے۔ اشتراکیت کا یہ مطلب ہے ، نہ کبھی تھا۔ اشتراکیت جس چیز کو منسوخ کرتی ہے وہ ہے سرمایہ دارانہ نوعیت کی نجی ملکیت ، جس کی بنیاد فاضل قدر محنت پر استوار ہوئی ہے ، یعنی غصب شدہ مزدوری پر ، یعنی استحصال پر ، یعنی ڈکیتی پر : جیسا کہ کارل مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھا : ”اشتراکیت کی بنیادی خصوصیت عام ملکیت کی منسوخی نہیں ہے بلکہ سرمایہ دارانہ ملکیت کی منسوخی ہے۔ ......سرمایہ ایک اجتماعی پیداوار ہے اور صرف معاشرے کے بہت سے

ارکان کے متحدہ عمل کے ذریعے ہی ، بلکہ اگر اچھی طرح سے کھنگالا جائے تو صرف معاشرے کے تمام ارکان کے متحدہ عمل کے ذریعے ہی اس (سرمایے) کو حرکت میں لایا جا سکتا ہے - اس لیے سرمایہ کوئی شخصی یا ذاتی پیداوار نہیں ہے بلکہ سماجی پیداوار ہے - جب سرمایے کو عمومی ملکیت میں تبدیل کیا جائے ، یعنی سماج کے تمام ارکان کی ملکیت میں ڈھالا جائے تو ذاتی ملکیت سماجی ملکیت میں تبدیل نہیں ہوگی - اس ملکیت کا محض سماجی کردار بدل جائے گا ، اس کا طبقاتی روپ ختم ہو جائے گا -''

یہ بھی خیال رہے کہ صرف اشتراکیت ہی میں اس امر کی گنجائش ہے کہ سماج کے ارکان کی اکثریت کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ کچھ ذاتی ملکیت رکھ سکیں ؛ سرمایہ دارانہ نظام میں تو ان کے پاس اپنی قوتِ محنت کے سوا کوئی بھی ملکیت نہیں ہوتی -

اسلام کا منشا تو یہ ہے کہ جو شے کسی فرد یا کسی گروہ کی ایمان دارانہ محنت کا پھل ہو وہ اس کی ملکیت ہو اور اُسی کو اُسے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو - سرمایہ ــ مجسم محنت ، غصب شدہ مزدوری ــ آج اُن لوگوں کی ملکیت ہے جنھوں نے اُسے اپنی محنت سے حاصل نہیں کیا - یہی وجہ ہے کہ اقبال ، جو اتنا ہی سچا مسلمان تھا جتنا کہ کوئی بھی ہمارے زمانے میں موجود ہے ، سرمایہ داری کا شدید ترین دشمن تھا - ۱۹۰۳ء میں ، اپنی کتاب علم الاقتصاد میں اُس نے سرمایہ دارانہ استحصال پر حملہ شروع کر دیا تھا - سرمایہ داری نظام پر اس کی تنقید محض ایک غیر واضح بے اطمینانی کا حاصل نہ تھی بلکہ ایک واضح عالمانہ تجزیے کا نتیجہ تھی جس کی بنیاد اشتراکیوں کے نظریہ فاضل قدرِ محنت پر رکھی گئی تھی - مندرجہ ذیل اشعار اس بات کا ثبوت ہیں :

کارخانے کا ہے مالک مردکِ نا کردہ کار
عیش کا پُتلا ہے ، محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے ''لیس للانسان الا ماسعیٰ''
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

یہاں تک یہ دیکھنا مقصود تھا کہ آیا اسلام اور سرمایہ داری میں

کوئی قدر مشترک ہے یا نہیں - اس سے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اقبال نے اپنی تحریروں میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے حق میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا اور نہ اس کے لازمے ، عالمگیر سامراجیت ، کے حق میں کوئی دعائے خیر کہی ہے -

رہی اشتراکیت تو اقبال نے نہ صرف اشتراکیت کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ سومار صاحب کے قول کے برخلاف اس نے اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کو واضح طور پر ایک ہی بتایا ہے - ضرب کلیم کی مندرجہ ذیل نظم میں اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام میں دولت کی اجارہ داری کے برخلاف اشتراکیت کو اسلامی نظریۂ انصاف کی تشکیل کے طور پر پیش کیا ہے :

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئی رفتار
اندیشہ ہؤا شوخئی افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

پھر قائد اعظم کے نام ایک خط میں (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء) اقبال نے اشتراکیت کے بارے میں ہندو ازم اور اسلام کے نقطۂ نظر کا موازنہ کیا ہے - یہ اقبال کی ایک اہم تحریر ہے ، اس لیے کہ اس میں اُس نے برصغیر میں اپنے الگ ملک کے لیے لڑتے ہوئے مسلمانوں کے ایک نہایت ہی اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے - یاد رہے کہ اس تحریر کا لکھنے والا اور اس کا مخاطب دونوں ایسے اصحاب ہیں جنھیں جدید اسلام کے دو سب سے بڑے مفکروں اور رہنماؤں کا رتبہ حاصل ہے :

جواہر لال کی اشتراکیت خود ہندوؤں میں کشت و خون کا موجب ہوگی - سوشل ڈیما کریسی اور برہمنیت کے

درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے ۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا یا نہیں میں اس سے متعلق تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا لیکن مجھے اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ ہندو دھرم سوشل ڈیما کریسی اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم کا خاتمہ ہے ۔ اسلام کے لیے سوشل ڈیما کریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج ، جب اُسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو ، حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا ۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے ۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یورپ میں اُن اشتراکی جماعتوں کا نام ، جو پہلے اور دوسرے کمیونسٹ انٹرنیشل کی رکن تھیں ، سوشل ڈیما کریٹک لیبر پارٹی یا محض سوشل ڈیما کریٹک پارٹی ہوتا تھا ۔ اس لیے اقبال نے اشتراکیت اور سوشل ڈیما کریسی کے الفاظ ایک ہی مطلب کے لیے استعمال کیے ہیں ۔

ایک اور خط میں اقبال نے سرفرانسس ینگ ہزبینڈ کو لکھا ہے (۱۹۳۰ء) :

اگر بالشویزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بالشویزم اسلام کے بہت ہی قریب آ جاتا ہے ۔ اس لیے میں متعجب نہ ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر ۔

یہ درست ہے کہ اقبال نے ”اسلامی اشتراکیت“ کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں کی ؛ سب سے پہلے اسے قائد اعظم نے چٹاگانگ میں اپنی ایک تقریر میں (۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء) استعمال کیا تھا ۔ اُن کے بعد ہمارے بڑے بڑے عمائدین میں سے جناب لیاقت علی خاں اور صدر ایوب خان نے اسے استعمال کیا ہے ۔ ہر چند کہ اقبال نے اصطلاح استعمال نہیں کی لیکن یہ واضح ہے کہ اُس نے اپنی زندگی میں اس مسئلے پر بہت غور و خوض کیا تھا کہ اشتراکیت کی معاشی اور سیاسی تحریک کو ایک اسلامی معاشرے سے کیوں کر متعلق کیا جا سکتا ہے ۔

فکر اقبال کی روشنی میں اس بحث کے بعد کہ ایک مسلمان کا اشتراکیت جیسے جدید معاشی مسئلے کے بارے میں کیا نقطۂ نظر ہو سکتا ہے ہم اس مسئلے سے بحث کر سکتے ہیں کہ آیا اسلام کا قانون یا فقہی نظام نجی یا مشترکہ ملکیت کے بارے میں کسی ازلی ابدی ، ناقابلِ تفسیر احکامات کا حامل ہے یا نہیں ۔ اس مسئلے سے بحث اس لیے ضروری ہے کہ سومار صاحب نے اپنے بیان میں اس ازلی ابدی ناقابلِ تغیر صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

> میں بہت شدت سے اس نظریے کا قائل ہوں کہ اسلام ایک مکمل آئینِ حیات کا نام رہا ہے جو معاشرتی ، سیاسی ، معاشی اور انسانی زندگی کے تمام دیگر شعبوں پر حاوی ہے ۔

سومار صاحب کی بات کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے معاشرتی ، سیاسی ، معاشی اور انسانی زندگی کے دیگر شعبوں میں 'بت پرستی' (یعنی خوفِ ماسوا) کی مکمل تنسیخ کر دی ہے اور تمام شعبہ ہائے حیات میں انسانی فکر کو رضائے الٰہی کے ساتھ مکمل اور مطلق ہم آہنگی کا سبق دیا ہے لہذا عالم موجود کی کوئی گزرتی ہوئی ، گزر نے والی شکلیں ، اور محض زمانی یا مکانی اختیارات ہمارے جذبۂ عبودیت کا مرکز نہیں ہو سکتے ۔ اگر یہ معنی ہیں تو ان سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اگر اُن کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے ایک ارتقا پذیر ، بدلتے ہوئے عالمِ امکان میں انسانی جانوں پر ایک جامد و ساکن ، نہ بدلنے والی غیر ارتقائی معاشرتی ، سیاسی اور معاشی عمارت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلط کر دی ہے ۔ تو یہ بالکل غلط ہے اور اس قسم کے تصور کو اس متحرک اور فعّال نقطۂ نظر سے کوئی نسبت نہیں جیسے قرآن نے مسلمانوں کو ودیعت کیا ہے ۔

کائنات تاریخی ہے ، ارتقا پذیر ہے ، بدل رہی ہے ، جامد نہیں ہے ۔ اگر یہ جامد ہوتی یا اس کی تخلیق سے مدعا یہ ہوتا کہ اسے انسانی اور حیوانی فطرتوں اور صورتوں کے ایک لامتناہی، ناقابل تغیر تواتر کی آماجگاہ رہنا ہے تو ہندوؤں کی طرح ، جن کا تصورِ کائنات اسی لامتناہی تواتر پر مبنی ہے ، ہم بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتے تھے کہ انسان کے لیے معاشرتی زندگی یا فطرت ہیں کسی چیز کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے ۔ اسی قسم کا تصور منوسمرتی کی اٹل طبقاتی تقسیم کو پیدا

کرتا ہے ۔ اسلام میں انسان آزاد اور ذمہ دار ہستی ہے ۔ وہ اپنے نیک اعمال کے لیے ہی جوابدہ نہیں بلکہ اپنے بد اعمال کا خمیازہ بھی بھگتتا ہے ۔ اور اُس سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اُسے اُس کے نیک و بد کا اجر دیا جائے گا ۔ خدا نے قرآن میں بار بار تغیر اور ارتقا پر زور دیا ہے ۔ اور بار بار انسان سے اس عمل ارتقا پر غور کرنے کے لیے کہا ہے اور خود اُسی پر اپنے آپ کو اور اپنے حالات کو تبدیل کرنے کی ذمہ داری رکھی ہے ۔ میں صرف چند آیات دھرانے پر اکتفا کروں گا :

یزید فی الخلق مایشاء ○
وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے ۔

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق
ثم اللہ ینشئی النشاۃ الا خرۃ ○

کہہ دے ، زمین پر نکل جاؤ ، اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح مخلوق کو پیدا کیا ، وہ آخرۃ میں مخلوق کو پھر پیدا کرے گا ۔

فلا اُقسم بالشفق ○ و الیل و ما وسق ○
و القمر اذا التسق ○ لترکبن طبقاً عن طبق ○

میں قسم کھاتا ہوں شفق کی ، اور رات کی ، اور جس چیز کو اکٹھا کرتی ہے رات ۔ اور چاند کی ، جب وہ پورا ہو جاتا ہے ۔ تم کو یقیناً ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں پہنچنا ہے ۔

الم تر الیٰ ربک کیف مد الظل و لو شآء لجعلہ' ساکناً ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلاً ○ ثم قبضنہ' الینا قبضاً یسیراً ○

کیا نہیں دیکھا ، کیسے تیرے رب نے سایے کو لمبا پھیلایا ہے ۔ اگر وہ چاہتا تو اس کو ساکن کر دیتا لیکن ہم نے آفتاب کو اس کی دلیل بنایا ۔ پھر ہم نے اُسے اپنی طرح کھینچ لیا ، آہستہ آہستہ ۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم ۔

واقعی اللہ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب
تک وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتی ۔

اسلام کا قانونی نظام — شریعت — جو مسلمان قوموں کے تمام سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقائق پر حاوی ہے، اس متحرک اور ارتقا پذیر دنیا میں کبھی ایک ساکن و جامد، بے تغیر اور ناقابل تبدل نظام نہیں رہا ہے اور نہ رہ سکتا ہے ۔

اسلام کی پہلی تین صدیوں میں، بلکہ محض پہلی ایک صدی میں، جو قانونی ارتقا ہوا ہے، اس کے ایک سرسری جائزے سے بھی یہ حقیقت منعکس ہو جاتی ہے کہ اسلامی قانون میں اضافے، ترمیمیں اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ۔ اسلامی قانون کوئی "کوڈ نپولین" تو نہیں جس کا محرک سرمایہ دارانہ ملکیت کی تقدیس کو مسلط کرنا ہو ۔ یہ تو خدا کے ازلی ابدی پیغام کی تفسیر ہے — اُن کے لیے جو اُس کی رضا کے سامنے سر جھکاتے رہے، اُن تمام تاریخی حالتوں اور شکلوں میں جن سے ملکیتی تعلقات اسلامی معاشرے کے ارتقا کے دوران میں گزرے ہیں ۔

ترکوں نے خلافت کے منسوخ کرنے کے بعد اتاترک کی قیادت میں جو قانونی اصلاحات نافذ کیں، اقبال اُن کے بارے میں یوں لکھتا ہے :

جو سوال آج ترکوں کو درپیش ہے، اور جو کل دیگر مسلمان ملکوں کے سامنے آئے گا، یہ ہے کہ آیا اسلامی قانون میں ارتقا کا امکان ہے یا نہیں ۔ اس کے مناسب حل کے لیے بڑی شدید دماغی کاوش کی ضرورت ہوگی اور اس کا جواب یقیناً اثبات میں دیا جائے گا ؛ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کو حل کرنے میں حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلے ۔ حضرت عمرؓ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے ناقدانہ اور آزاد ذہن رکھنے والے مسلمان تھے جنھوں نے رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری لمحوں میں مندرجہ ذیل قابلِ قدر الفاظ کہنے کی اخلاق جرأت دکھائی تھی :
'خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے — .. .. '

ہرچند کہ ہمارے علماء شدت سے تقلید پسند واقع ہوئے ہیں ۔ نئی زندگی کے آنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی ہمہ گیر روح یقیناً اپنا اثر دکھائے گی ۔ میرے دل میں کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام کے ضخیم قانونی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو جدید نقدوں کو

اپنا یہ سطحی فیصلہ بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانون جامد ہے اور اس میں ارتقا کا امکان نہیں ہے۔ کیا ہمارے فقہ کے مختلف دبستانوں کے مؤسّسوں نے کبھی یہ دعویٰ بھی کیا کہ اُن کے دلائل یا تعبیریں اور تاویلیں حرفِ آخر ہیں ؟ کبھی نہیں۔ مسلمان حریت پسندوں کی جدید نسل کا یہ کہنا کہ اُن کو اپنے تجربے اور جدید زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں بنیادی قانونی اُصولوں کی تعبیر کرنی ہے میری نظر میں بالکل جائز مطالبہ ہے۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ زندگی ایک مسلسل ارتقائی تخلیق کا نام ہے۔ اس تعلیم سے ہم پر لازم ہے کہ ہر نئی نسل اپنے مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کی مجاز ہو، وہ اگلی نسلوں کے کام سے رہنمائی حاصل کرے لیکن اُن کو اپنے رستے کی رکاوٹ نہ بننے دے۔

(سِکس لیکچرز، صفحہ ۱۶۸—۱۶۲)

سومار صاحب نے قرآن کی اس آیت کا حوالہ بھی دیا ہے کہ ''آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔'' لیکن اس آیت سے یہ مطلب نکالنا کہاں تک درست ہے کہ اسلام کا قانونی نظام مکمل ہو چکا اور اس پر مُہر لگ چکی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں گنجائش موجود ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت انسان کے ہاتھوں استحصال کو — اور سرمایہ دارانہ ملکیت کے حق اور ''آزاد تجارت'' کو جائز قرار دے دے لیکن محنت کش طبقوں کے اس حق کی گنجائش اس میں موجود نہ ہو کہ وہ اس استحصال کو ختم کر ڈالیں۔

یہ تو اسلام کے قانونی نظام کو ایسے معانی پہنانا ہے جو فقہ کے مختلف دبستانوں کے ارتقا کی نفی کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس حقِ مطلق کی بھی نفی کرتے ہیں جس نے انسان کو اپنے نیک اور بد اعمال کا خود ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور جس نے کہا ہے : ''واقعی اللہ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتی۔''

ان تمام مسئلوں پر سومار صاحب کو ابھی اپنے دعووں کو ثابت کرنا ہے۔ اسلام مکمل دین ہے، یقیناً ہے۔ تبدیلی سے آزاد ہے لیکن مسلمان قوموں کے قانونی نظام ساکن و جامد نہیں ہیں بلکہ ارتقا پذیر ہیں۔ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔ بلکہ موافقت کرتے

ہیں اور ایک مسلمان اشتراکیت کو معاشرے کے جدید معاشی اور سیاسی مسائل کے حل کے طور پر قبول کر سکتا ہے۔ اور آخر میں اقبال، جو اسلام اور اشتراکیت کی موافقت میں یقین رکھنے والوں کا پیش امام تھا، نہ تو معاشی اور سیاسی مسائل کے علم سے نا آشنا تھا اور نہ اسلام کے اُصولوں سے ناواقف تھا۔ اُس نے حقائق کو اچھی طرح کھنگال کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ نہ وہ کوئی منافق تھا جو اشتراکیت کو اسلام کے پردے میں چھپا کر پیش کر رہا تھا۔ لہٰذا اگر قائد اعظم یا جناب لیاقت علی خان یا صدرِ ایوب خان اور دیگر رہنما اس اصطلاح یعنی ''اسلامی اشتراکیت'' کا استعمال کرتے ہیں، تو اُنہیں اس کے لیے کسی معافی نامے کی ضرورت نہیں ہے۔ صدر پاکستان نے قوم کے سامنے تیسرے پنج سالہ منصوبے کو پیش کرتے ہوئے اس مسئلے کو واضح لفظوں میں حل کر دیا تھا: ''معاشی اور معاشرتی میدان میں ہماری تمام کوششوں کا منتہا اور مقصود یہ ہے کہ جلدی سے جلدی ہم پاکستان میں اسلامی اشتراکیت کے قیام کی منزل کی طرف گامزن ہوں۔''

رہے وہ حضرات جو تاریخی قوتوں کی رفتار کو روکنے کے لیے ہمارے پاس یہ دلیل لاتے ہیں کہ وہی اسلام کی تعبیر و تفسیر کے سلسلے میں افضل سند اور حرفِ آخر کے حامل ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ تاریخ نے اس سے پہلے بھی ان افضل سند کے دعویداروں کو غلط ثابت کیا ہے۔ سرسید احمد خان کو انھی سے واسطہ پڑا تھا، پھر اقبال کو، پھر قائداعظم کو۔ کیا یہی وہ فاضلین نہیں تھے، یا ان جیسے دوسرے، جن کو پاکستان کی جد و جہد کے دوران میں ہمارے دشمنوں نے تحریک کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا تھا؟ یہی وہ لوگ تھے، یا ان سے ملتے جلتے لوگ تھے جو ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ قومیت کا قیام غیر اسلامی فعل ہوگا اور دوسری طرف ایک ایسی قومی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے تھے جسکا مطلب مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانا تھا۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے اُسی تجربے کا اعادہ ہے۔ ہم پاکستان میں ایک عظیم معاشرتی اور معاشی تبدیلی کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آج پھر ہمارے معاشرے کی رجعت پسند طاقتیں علماء کی حمایت اور سند حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں تاکہ اس معاشرتی تبدیلی کو روکا جا سکے۔ جو روحانی طاقت '' خیر کثیر '' بن کر آئی تھی اُسی کو آج ایک قلیل

ترین تعداد کی بھلائی کے جواز کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اشتراکیت کے مقابلے پر لانے کی کوشش اس لیے ہو رہی ہے کہ اس قلیل تعداد ــ یعنی پاکستان کے لگ بھگ دو سو خانوادوں ــ کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے جو ملک کے پیداواری وسائل کے بڑے حصے پر قابض ہے اور اگر اشتراکی پیداوار کا ڈول ڈالا گیا تو انہیں کو نقصان پہنچے گا ۔ ہر چند کہ سُومار صاحب کہتے ہیں کہ جیسے اسلام میں اشتراکیت کا تصور غیراسلامی ہے ویسے ہی ''اسلامی سرمایہ داری'' ایسا بھی کوئی تصور موجود نہیں ہے ۔ لیکن جب موجودہ صورت حال کو قائم رکھنے کے لیے علماء کی سند کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ سرمایہ داری کو '' اسلامی'' بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ اس کا کوئی بھی اچھا سا نام آپ رکھ لیں ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

علماء عام مسلمانوں کی نسبت عربی زبان سے بہتر طور پر واقف ہیں ۔ شاید یہ بھی صحیح ہو کہ ان کے پاس ہمارے تاریخی ماضی کے قانونی نظاموں کے بارے میں زیادہ '' خبر '' ہو ۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے مخصوص عہد کے جدید مسائل پر ان کو ہماری نسبت زیادہ بہتر '' نظر '' ودیعت ہوئی ہے تو اس کا ثبوت ابھی تک تو انہوں نے کوئی نہیں دیا ۔ جن لوگوں کی مساعی نے ہماری قوم کے معاشرتی اور سیاسی اور فکری ارتقا میں پچھلے سو سال میں کوئی اہم کردار ادا کیا ہے وہ اس گروہ سے باہر کے لوگ ہیں ۔ کچھ عام شہری جیسے سرسید ، اقبال ، اور قائداعظم ۔ اور ایک سپاہی ، ایوب خان ۔

اگر علماء چاہتے ہیں کہ ہمارے جدید مسائل کے بارے میں وہ کوئی رائے دیں اور ہم اُسے سنیں تو اُن پر لازم آتا ہے کہ پہلے اقبال اور جناح کی طرح ان حقائق کا واقعی علم حاصل کریں جن پر اُن کو فتویٰ دینے کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے ۔ پہلے وہ سوچ سمجھ لیں کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت حقیقت میں ہیں کیا ۔ پھر وہ فیصلہ صادر کرنے کے مجاز ہیں کہ آیا اسلام کے اندر ان میں سے کسی ایک معاشی نظام کی گنجائش ہے یا نہیں ۔

سُومار صاحب نے اسلامی اشتراکیت کی اصطلاح کے استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے ۔ اگر اُن کو کوئی اس قسم کا اعتراض ہے کہ

گرامر کی رو سے یہ اصطلاح غلط ہے تو انہیں فوراً مطمئن ہو جانا چاہیے ، گرامر کی رو سے یہ اصطلاح ایسے ہی درست ہے جیسے "اسلامی جمہوریہ" کی اصطلاح ۔ اگر اس میں کوئی تناقص یا تضاد ہوتا تو قائداعظم کا قانونی ذہن اس کو کبھی قبول نہ کرتا ۔ اور پھر اصل جھگڑا اصطلاحی نہیں ہے ۔ ہمیں اس بات کی فکر نہیں ہے اور نہ ہونی چاہیے کہ اپنے معاشرے کی آئندہ معاشی شکل کا نام کیا رکھیں ۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ اس معاشی شکل کے اجزائے ترکیبی کیا ہوں گے ۔ یہ اجزائے ترکیبی ہیں : دین اسلام اور اشتراکیت ۔ اشتراکیت کی ماہیئت یہ ہے کہ تمام وسائل پیداوار سارے معاشرے کی بحیثیت مجموعی ملکیت ہوتے ہیں ، اسی طرح ہر جیسے آج بھی ہماری ریلوے ، بندرگاہیں ، دریائی راہ گزر ، ہوائی سفر کے وسائل ، میونسپل ضروریات ، بند اور بیراج اور بجلی گھر ، اسلحہ ساز کارخانے ، سکول کالج اور یونیورسٹیاں وغیرہ تمام اجتماعی ملکیت ہیں ۔ اسلام کی بنیادی ماہیئت ایمان کے ارکان ہیں جن میں سے سب سے اول یعنی کلمۂ طیّبہ ہمیں سکھاتا ہے کہ مطلق حاکمی صرف خدا کو ہے ۔ اس ایمان کا لازمہ ہے کہ تمام مسلمانوں میں تمام معاملوں میں مطلق برابری قائم ہونی چاہیے ۔ ایک مسلمان دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا اگر وہ یہ کہے کہ تمام وسائل پیداوار معاشرے کی بحیثیت مجموعی ملکیت ہونے چاہییں ۔ یہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ پاکستان کے آغاز ہی سے مندرجہ بالا وسائل پیدوار تمام پاکستانیوں کی بحیثیت مجموعی ملکیت رہے ہیں اور آج بھی ہماری معاشی تنظیم میں پبلک سیکٹر موجود ہے اور آئندہ بھی رہے گا ۔ جب تک ہم اس پبلک سیکٹر اور تمام وسائل پیداوار کو اجتماعی ملکیت قرار نہیں دیتے ہم سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان لٹکتے رہیں گے ۔ جس دن ہم اس مقام سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ہم اشتراکی ہو جائیں گے ۔ اُس وقت ہم اپنے آپ کو مسلمان اشتراکی کا نام دے سکتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ لامذہبیت اشتراکیت کا ضروری جزو نہیں ہے ، اُسی طرح جیسے لامذہبیت سرمایہ داری کا بھی ضروری جزو نہیں ہے ، ہر چند کہ یورپ میں سرمایہ دارانہ انقلاب کے دانشوروں نے لامذہبیت کے فلسفے سے ہی جاگیرداری نظام کی مدافعتی تدبیروں کو ختم کیا تھا ۔ جاگیرداری نظام کے قوانین سرمایہ دارانہ "آزاد تجارت" سے متصادم تھے ۔ ان

قوانین کی پشت پناہی میں زمانۂ وسطیٰ کا یورپی مذہبی نظام کہتا تھا کہ یہ قوانین ازلی ابدی اور لاتغیر ہیں - لہذا سرمایہ‌داری کے حامی دانشوروں نے جاگیردارانہ مذہب کے خلاف لامذہبیت کا فکری محاذ قائم کر لیا -

رہے ہم ، تو جو فکری نظام اس چیز سے پیدا ہوگا کہ پاکستانی مسلمان اشتراکیت کی معاشرتی اور معاشی تنظیم کو رائج کریں ، اُسے تو ہم اسلامی اشتراکیت ہی کہیں گے اور کہنا بھی چاہیے -

---

تقریر

اسلامی سوشلزم

پروفیسر محمد عثمان

پاکستان کونسل ، راولپنڈی - ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶

میں خیال کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں اسلامک سوشلزم کی بحث گذشتہ چند ماہ میں جہاں جاذب توجہ بنی ہے وہاں خاصی الجھ بھی گئی ہے - کچھ حضرات نے نہ صرف اس کی اسمی ترکیب کو قابل اعتراض اور خلافِ روحِ اسلام قرار دیا ہے بلکہ اس ترکیب یا تحریک کے پیچھے جو جذبہ اور فکر کام کرتا ہے ، اس کی صحت و افادیت اور اسلامیت سے بھی انکار کر دیا ہے - ایک دو صاحبوں نے تو جوشِ بیان میں اس کے لیے کچھ ایسے ''کلماتِ توصیف'' استعمال کیے ہیں جنھیں علمی لحاظ سے خلافِ آداب اور سیاسی زبان میں غیر پارلیمانی کہا جا سکتا ہے - اس کے مقابلے میں جو لوگ اس تحریک یا خیال کی حمایت و مدافعت میں سرگرم ہیں ، وہ بسا اوقات ایسا طرز استدلال اختیار کرتے ہیں جو ان کے موقف کو کمزور کر دیتا ہے یا پھر ان کو اسلامی سوشلزم کے بجائے محض سوشلزم یا کمیونزم کا حامی و علمبردار ثابت کرتا ہے - ظاہر ہے کہ یہ سب امور ایک سیدھی سادی بات کو پیچیدہ بنانے ہی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں -

میرا خیال ہے کہ پہلے میں آپ سے وہ سیدھی بات بیان کر دوں جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے - آپ قرآن حکیم کو الحمد سے والناس تک

پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جن مسائل کو حضور باری تعالیٰ نے بار بار ذکر فرمایا اور جن کے بارے میں جگہ جگہ ہماری رہنمائی فرمائی ہے ان میں ایک معاشی مسئلہ بھی ہے۔ نزولِ وحی کے بالکل ابتدائی زمانے کی بہت سی سورتوں میں غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے اور یتیموں اور محتاجوں کی ضروریات کی دیکھ بھال کو بنیادی اور فیصلہ کن نیکی قرار دیا گیا ہے۔ ذرا آگے چل پر دولتمندوں اور ذی استطاعت لوگوں کو یہ بتایا اور سمجھایا گیا ہے کہ تمہارے مال و دولت میں غریبوں کا ایک واضح حصہ ہے اور یہ حصہ بطور حق کے ہے۔ پھر مسلمانوں کو صدقہ و خیرات کی جا بجا تلقین کی گئی ہے اور خدا کی راہ یعنی رفاۂ عامہ پر خرچ کیے بغیر نیکی کا حصول ناممکن قرار دیا گیا ہے۔ زکٰوۃ پر جو زور قرآن حکیم میں ہے وہ ہر مسلمان اور قرآن خواں پر روشن ہے۔ بیسیوں مقامات پر جہاں صلٰوۃ کی تلقین و تاکید ہے اس کے ساتھ ہی فریضۂ زکٰوۃ ادا کرنے کا حکم ہے۔ ان احکام کے ساتھ سود کی نہایت سختی سے ممانعت کی گئی ہے تاکہ روپے پیسے والے غریبوں کو لوٹنے کی نفسیات سے مبرا رہیں۔ ایک جگہ بن لڑائی کیے ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت کو غربا میں تقسیم کرنے کا حکم ہے اور اس حکم کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ دولت صرف دولتمندوں کے درمیان ہی نہ رہ جائے۔

ان سب احکام و تلقین اور تاکید و تحریک کا نتیجہ یہ ہؤا کہ مسلمان اجتماعی مفاد میں دولت خرچ کرنے اور غربا کی مدد پر ایسے آمادہ و مستعد ہوئے کہ استطاعت کے مطابق خرچ کرنے کے باوجود اُن کا ذوقِ انفاق مطمئن نہ ہوتا تھا اور وہ رسول کریم سے دریافت کرتے تھے کہ مزید کیا اور کتنا خرچ کریں۔ اس پر یہ آیت مبارک نازل ہوئی کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ بچتا ہے، چاہو تو سب کا سب رفاۂ عامہ میں صرف کر ڈالو: - یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ○ قُلِ الْعَفْوَ ○

ان احکام کی روشنی اور برکت سے جو معاشرہ تعمیر ہؤا، وہ انسانی تاریخ کا ایک روشن ترین باب ہے اور اس کی جزویات اور تفصیلات دوستوں اور دشمنوں پر ایسی عیاں ہیں کہ کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ مدینے کے انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ محبت و اشتراک کا یہ ثبوت دیا کہ نہ صرف کاروبار اور گھربار بانٹ لیے بلکہ بعض انصار نے جن کی زوجیت میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں اپنی کسی بیوی کو

اس جذبے سے طلاق دے دی کہ اس کا مہاجر بھائی اپنا گھر بسا لے ۔

رسول اکرمؐ کے بعد حضرت ابوبکر کی زندگی اور دور میں اخلاص و اشتراک کا یہ جذبہ برقرار رہا ۔ حضرت ابوبکر نے اپنے روزمرہ خرچ کے لیے صرف اسی قدر لینا گوارا کیا جو مملکت کے غریب سے غریب مسلمان کی اوسط کمائی کے برابر تھا ۔ اور جب مسلمانوں ہی کے ایک گروہ نے زکٰوۃ کے اصول اور ادارے سے انحراف کرنا چاہا تو حضرت ابوبکر نے ان کے اس فعل کو جنگ وقتال سے زیادہ سنگین خیال کیا اور منکرین زکٰوۃ کو راہِ راست پر لائے بغیر دم نہ لیا ۔

حضرت عمر کی سادگی ، ایثار ، عوام سے ان کی محبت اور ان کی خبرگیری کے جذبے سے ہم سب واقف ہیں ۔ امیرالمومنین عمر کی زندگی کے کتنے ہی واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کے دور میں ہر مرد اور عورت ، ہر بچے اور بوڑھے کی بنیادی ضروریات کی کفالت پر مملکت کی نگاہ تھی ۔

ہم میں سے کوئی شخص اس عقیدے سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول اکرم اور آپ کے فوراً بعد کا عہد اسلامی زندگی کا بہترین نمونہ ہے لیکن افسوس کہ جہاں انفرادی زندگی کے لیے ہم نے اس کی طرف بار بار پلٹ کر دیکھا اور اس سے مقدور بھر روشنی اور رہنائی حاصل کی ، وہاں غالباً قومی شعور کی کمی کے باعث ، اس کے اجتماعی اور بالخصوص معاشی پہلو سے ہم نے کچھ سبق نہ سیکھا ورنہ ہماری معاشرتی زندگی کے بہت سے ناسور صدیوں یوں نہ رستے رہتے، ان کا علاج کب کا ہو چکا ہوتا ۔

غلط فہمی ، لاعلمی یا تنگ نظری کی اور بات ہے ورنہ اگر آپ سوشلزم کی اصل اور اس کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہیں تو آپ اچھی طرح جانتے ہونگے کہ سوشلزم کا بنیادی مفہوم سوسائٹی میں تقسیمِ دولت کی ناہمواری کو کم کر کے معاشرتی انصاف قائم کرنا ہے تاکہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تمام افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا معاشرہ صحتمند اور مضبوط ہو ۔

میں اپنے اس بیان کی صداقت کے کچھ ثبوت آئندہ سطروں میں پیش کروں گا ۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں تک انسان کے معاشی مسئلے کا تعلق ہے آپ غور فرمائیں کہ اسلام کے مقاصد اور سوشلزم کے مقاصد میں کسقدر اتحاد اور یکسانی ہے ۔ رسول اکرم اور حضور کے فوراً بعد

کے اسلامی معاشرے کو اگر جدید اصطلاحی زبان میں بیان کرنا ہو تو آپ اسے بلاخوف تردید ایک سوشلسٹ معاشرہ قرار دے سکتے ہیں - اور قرآن حکیم معاشی مسائل میں ہمیں جو مجموعی انسانی نقطۂ نظر بخشتا ہے وہ مروجہ نظام ہائے معاشی میں سب سے زیادہ سوشلزم کے قریب ہے -

(۲)

ہمارے ہاں فکری الجھاؤ کی سب سے بڑی وجہ اب یہ ہے کہ واقفیت کی کمی کے باعث ہمارے عوام اور خواص کا ایک بھاری طبقہ کمیونزم اور سوشلزم کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ تاریخ کا جو مادی نظریہ ، طبقاتی جنگ کا جو تجزیہ اور اس کے علاج کی جو صورتیں کمیونزم کا جزو لاینفک ہیں ، سوشلزم کے اجزائے ترکیبی بھی وہی ہیں - لہذا وہ اسلام اور سوشلزم میں وہی مغائرت اور بُعد تصور کرتا ہے جو اُن کے ایمان کی رُو سے اسلام اورکمیونزم میں واقعتاً پایا جاتا ہے - میرے خیال میں اس زمانے میں اس سے بڑی اور افسوسناک تر غلط فہمی کوئی اور نہیں ہو سکتی -

آپ سوشلزم پر کسی بھی قابل ذکر مصنف کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیے یا برطانیہ یا امریکہ کے تیار کردہ انسائیکلوپیڈیا سے سے رجوع کیجیے تو آپ کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ سوشلزم اور کمیونزم دو مختلف بلکہ بعض اعتبار سے دو متضاد تحریکیں ہیں اور جہاں تک کمیونزم کے تاریخی ، طبقاتی اور انقلابی افکار کا تعلق ہے اکثر سوشلسٹ جماعتیں در حقیقت ان کی ضد اور ان کی تردید پر قائم ہیں -

سوشلزم کو کمیونزم خیال کرنے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا جو چند سال پہلے میرے ایک وکیل دوست نے مجھے سنایا تھا —— کسی شخص کے متعلق ہمارے ایک ضلعی تھانے میں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ وہ کمیونسٹ ہے اور اس کے احوال کی چھان بین کر کے رپورٹ کی جائے - اس غرض سے افسر تفتیش کنندہ نے زیر تفتیش شخص کے کسی پڑھے لکھے دوست سے ملاقات کی اور باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ کیا وہ شخص کمیونسٹ ہے ؟ دوست نے پولیس افسر کے سوال پر

حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "کمیونسٹ؟ بھئی وہ تو اینٹی کمیونسٹ ہے۔" افسر تفتیش کنندہ نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا "تو پھر کمیونسٹ ہی ہوا نا؟"۔ بدقسمتی سے افسر موصوف نے اپنی کمئی علم کے باعث اینٹی کمیونسٹ (Anti-Communist) سے سہا کمیونسٹ کا مفہوم اخذ کیا !!

بعینہ یہ صورتِ حال ہمارے ملک میں، اور بہت سے ملکوں میں، بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ بے شمار پہلوؤں سے سوشلسٹ تحریک "اینٹی کمیونسٹ" تحریک ہے، کمیونزم کا رد ہے، اس کا جواب ہے، اس کے سیلاب اور اگر یہ لفظ پسند کریں تو اس کی تباہ‌کاری کو روکنے کے لیے اعتدال، میانہ روی اور تدریج کا ایک مضبوط بند ہے مگر یہ لوگ جن میں خواندہ و نیم خواندہ، عالم و جاہل، سخت مذہب پسند اور شدید دنیادار سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں، ہمارے تفتیش کنندہ دوست کے وزن پر اسے کمیونزم ہی سمجھے جا رہے ہیں!

اپنے بیان کے ثبوت کے لیے میں انگلستان کی لیبر پارٹی اور مصر کی عرب سوشلسٹ یونین کا ذکر کروں گا۔ غالباً ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ انگلستان میں یہ پارٹی معرضِ وجود میں آئی۔ اس کی پیشرو دو جماعتوں کے نام برٹش سوشلسٹ پارٹی اور انڈی پینڈنٹ لیبر پارٹی تھے۔ لیبر جماعت ایک باقاعدہ سوشلسٹ جماعت ہے اور سوشلزم پر اس کے رہنماؤں اور قائدوں نے بے شمار رسالے اور کتابیں شائع کر رکھی ہیں۔ یہ جماعت اعتدال اور تدریج کے ساتھ انگلستان کے معاشی مسائل کو سوشلسٹ پیٹرن پر حل کرنے کی علمبردار اور پابند ہے۔ لیکن اس کے ارکان اور رہنما، الاماشاءاللہ، سب کے سب عیسائی ہیں۔ وہ نہ تاریخ کے مادی اور جدلیاتی تصور پر ایمان رکھتے ہیں، نہ وہ طبقاتی جنگ کے اُس تجزیے کو درست تسلیم کرتے ہیں جسے کارل مارکس نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے اور نہ وہ انقلابی اور غیر آئینی حربوں اور ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہیں جو بالعموم کمیونزم سے منسوب ہیں اور جنھیں اکثر کمیونسٹ اپنی زبان اور عمل سے بلاتامل اپنا لیتے ہیں۔ پہلی جماعت آئینی طریقوں سے، قانون سازی کے ذریعے سے، جمہوری اداروں کا پورا احترام کرتے ہوئے، رائے عامہ کی تربیت کر کے اور امن و آشتی کی فضا بحال رکھ کر انگلستان کے معاشی

نظام کو عوام کے حق میں مسلسل بدل رہی ہے اور گذشتہ بیس پچیس برس میں اس کی کامیاب آئینی کوششوں کو مبصرین نے ایک ”عظیم خاموش انقلاب“ سے تعبیر کیا ہے۔ انگلستان کی لیبر پارٹی ان کے اپنے دعویٰ اور لٹریچر کے رو سے پوری طرح ایک سوشلسٹ پارٹی ہے مگر وہ مذہبی اصولوں، اخلاقی قدروں اور باری تعالیٰ کے وجود سے منکر نہیں بلکہ اس میں ایک بھاری تعداد شدید مذہبی رجحان رکھنے والے انگریزوں کی ہے۔

اب آپ متحدہ عرب جمہوریہ کو دیکھیے۔ اس کے آئین کی دفعہ پانچ کی رو سے مملکت کا مذہب اسلام ہے اور دفعہ دو کا ترجمہ یوں ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ ایک جمہوری اشتراکی ریاست (Democratic Socialist State) ہے جو مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور سپاہیوں کے اتحاد پر قائم رہے گی۔ چنانچہ صدر ناصر کی سیاسی جماعت کا سرکاری نام عرب سوشلسٹ یونین ہے۔ اب اس بات سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا کہ صدر ناصر اور ان کی کابینہ کے ارکان اور ان کی عرب سوشلسٹ یونین کے لاکھوں کارکن اور قائدین (سوائے معدودے چند مصری عیسائیوں کے) سب کے سب مسلمان ہیں اور ان کو اپنی مسلمانی اتنی ہی عزیز ہے اور اس کے بارے میں وہ اتنے ہی جذباتی ہیں جتنے کہ ہم پاکستانی مسلمان ــ جذباتی سے یہاں میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ ان کی مسلمانی میں شک کا اظہار کریں گے تو ان کا رد عمل انتہائی ناخوشگوار پائیں گے۔

عالمِ اسلام کا ذکر چھڑ گیا ہے تو یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ عراق میں مرحوم صدر عارف کی جماعت اور الجزائر میں ماخوذ صدر بن باللہ کی جماعت اور ان دونوں ملکوں میں جو حکومتیں اب برسراقتدار ہیں، وہ بھی اپنے اپنے ہاں سوشلسٹ ریاستیں تعمیر کرنے کے منصوبے اور منشور کی پابند اور علمبردار ہیں اور ان کی مسلمانی کو بھی شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنا ہمارے لیے کوئی محفوظ طرز عمل نہیں ہو سکتا۔

پھر آپ سوشلسٹ انٹرنیشنل کا وہ اعلان پڑھیے جو ۱۹۵۱ء میں فرینکفورٹ (جرمنی) کے مقام پر منعقدہ ۲۳ ملکوں کی سوشلسٹ جماعتوں کی نمائندہ کانفرنس کے بعد جاری کیا گیا تھا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جدید سوشلزم (جسے اصطلاحاً جمہوری سوشلزم کہنا چاہیے) جہاں سرمایہ دارانہ نظام سے بہت مختلف ہے اور دولت کے چند ہاتھوں میں

جمع ہونے کی سخت مخالف ہے، وہاں وہ جمہورت پر اپنے غیر متزلزل ایمان کے باعث ہر قسم کی آمریت کے، جس میں مزدوروں کے نام پر نام ہونے والی کمیونسٹ آمریت بھی شامل ہے، شدید مخالف ہے۔ اس ضمن میں متذکرہ سوشلسٹ انٹرنیشنل کے منشور سے مندرجہ ذیل پیرا دیکھ لینا ہی کافی ہوگا۔

"کمیونزم کا سوشلسٹ روایت میں حصہ دار ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اُس نے در حقیقت اس روایت کو ناقابل شناخت حد تک مسخ کر دیا ہے اور ایک ایسا متشددانہ نظریہ حیات پیدا کیا ہے جو مارکسزم کی ناقدانہ روح کے منافی ہے۔ جہاں سوشلسٹوں کا مقصود اس استحصال کو ختم کرنا ہے جو سرمایہدارانہ نظام میں انسانوں کو گروہوں میں بانٹتا ہے، وہاں کمیونسٹ ایک پارٹی کی اکثریت قائم کرنے کی خاطر اس طبقاتی امتیاز کو اور گہرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں"۔

اپنی اس تمام گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں کہوں گا کہ جو لوگ آسانی کی خاطر یا لاعلمی کی بنا پر سوشلزم کو کمیونزم کے مترادف جانتے ہیں، شدید غلطی کے مرتکب ہیں۔ سوشلزم اپنے وسیع ترین مضمون میں صرف معاشی انصاف کی ایک تحریک ہے جسے کوئی بھی ملک یا کسی بھی اخلاقی یا مذہبی نظام کی قوم اپنا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے بعض ملکوں میں کرسچین سوشلسٹ جماعتیں بھی ہیں۔ لیکن بیشتر ڈیموکریٹک سوشلسٹ یا سوشل ڈیمو کریٹ جماعتیں ہیں جو سوشلزم اور جمہوریت کو لازم و ملزوم خیال کرتی ہیں اور قانونی اور پرامن ذرائع سے اپنے اپنے ملکوں میں معاشی انصاف کی راہ ہموار کرنے میں مصروف و سرگرم ہیں۔ اس طرح عرب ملکوں میں جو سوشلزم مقبول و رائج ہو رہا ہے اُسے کبھی عرب سوشلزم اور کبھی اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جن دو کتابوں کا چرچا عرب ملکوں کی سرحدوں سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک پہنچا ہے، اُن میں پہلی کتاب مصر کے خالد محمد خالد کی ہے جس کا انگریزی ترجمہ (From Here We Start) کے نام سے امریکہ میں شائع ہؤا ہے۔ اس میں مصر کی مخصوص مذہبی اور ثقافتی روایات کے پس منظر میں سوشلزم کو تعمیرنو کے ایک موثر لائحہ عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور

دوسری کتاب شام کے دانشور ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی کی ''اشتراکیت الاسلام'' ہے جس میں فاضل مصنف نے اسلامی اشتراکیت کو بڑے مدلل اور دلنشیں اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اور اسلام کے معاشی نقطہ نظر کے وہ امتیازات اور خصوصیات نہایت وضاحت اور تفصیل سے بیان کی ہیں جو اسے ایک طرف کمیونزم سے اور دوسری طرف مغربی سرمایہ داری سے متمیز و ممتاز کرتی ہیں۔

(۳)

اب اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ سرسید، اکبر اور حالی کے زمانے میں جدید نوع کا معاشی شعور نہ صرف ہم میں نہ ابھرا تھا بلکہ برصغیر کی دوسری قومیں بھی اس لحاظ سے کچھ بہتر نہ تھیں۔ ایشیا بھر میں یہ شعور اس صدی کے شروع میں، یا زیادہ درست طور پر یوں کہیے کہ، روسی انقلاب (۱۹۱۲ء) کے بعد عام ہؤا۔ ہندوؤں میں اس آگاہی کا پہلا نامور نمائندہ پنڈت جواہر لعل نہرو کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کو یہ شعور اور اس کی گہرائی پنڈت نہرو سے کہیں پہلے نصیب ہوئی تھی۔ اس کا ثبوت تلاش کرنا ہو تو ۱۹۰۲ میں ان کی شائع ہونے والی کتاب ''علم الاقتصاد'' سے لے کر ان کی وفات سے چند برس پہلے چھپنے والی مثنوی '' پس چہ باید '' کے علاوہ ان کی متعدد اُردو اور فارسی نظموں کو دیکھیے جن کا تعلق معاشی مسائل سے ہے۔ لیکن ہمارے موضوع کے نقطۂ نظر سے ان کے وہ خطوط جو انھوں نے قائداعظم کے نام مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۳۷ء تک لکھے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی تشویش ان کو مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی مستقبل کی طرف سے تھی اُسی قدر وہ اُن کی معاشی پسماندگی کے باعث فکرمند تھے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں ۱۹۳۵ء کے آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' مزید برآں یہ دستور تو اس معاشی تنگدستی کا جو شدید تر ہوتی جا رہی ہے کوئی علاج ہی نہیں ''

اور پھر نہایت عمدگی سے فرماتے ہیں

> '' فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا

اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو اور نہ کر سکے ، اُس کے لیے بے سود ہے ۔"

اور ایک دوسرے خط میں بر صغیر کے معاشی مسائل کا بہ تفصیل جائزہ لینے کے بعد اپنی سوچی سمجھی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں :

" اسلام کے لیے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا ، جب اسے شریعت کی تائید حاصل ہو ، حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں ، بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا "۔

اصل الفاظ یہ ہیں :

" For Islam the acceptance of Social Democracy in some suitable form and consistent with the legal principles of Islam is not a revolution, but a return to the original purity of Islam.[1]

اس اقتباس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو مردِ حق آگاہ ۱۹۰۸ سے ۱۹۳۸ء میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک برصغیر کے مسلمانوں کی جدا گانہ سیاسی ہستی کا علمبردار تھا ، اس کی بصیرت میں ہمارے معاشی مسائل کا حل اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کی ایسی موزوں صورت ہے ، جسے شریعت اسلامیہ کی تائید و موافقت حاصل ہو ۔ جیسا میں نے عرض کیا ، شعور آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے ۔ علامہ اقبال نے جس چیز کو ۱۹۳۷ء میں ، اشتراکی جمہورت کی موزوں صورت سے تعبیر کیا ، بعد میں قائد اعظم اور بالخصوص مرحوم لیاقت علی خان نے اُسے باقاعدہ اسلامک سوشلزم (Islamic Socialism) کا نام دیا ۔ طوالت کے خوف سے میں اپنی خواہش کے باوجود یہاں قائد اعظم اور مرحوم لیاقت علی خان کی تقریروں کے وہ حصے درج نہیں کرتا ، جو مروّجہ سرمایہ داری کی شدید مذمت میں اور اسلام کے اندر جو اشتراکیت پائی جاتی ہے ، اس کی حمایت میں لکھے گئے ہیں ۔ ایسا کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خود صدر ایوب نے ہمارے تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے

---

[1]Letters of Iqbal to Jinnah; Muhammad Ashraf, Lahore ; 1963; Page : 18.

مطبوعہ خاکے کے پیش لفظ میں اسلامی سوشلزم کو اپنی معاشی منزل قرار دے کر اور اس کی نہایت عمدہ اور درست وضاحت و تعریف کر کے ، میرے نزدیک اس سوال پر ایسا واشگاف اور حتمی بیان دے دیا ہے کہ اس کے بعد قومی سطح پر کسی معقول اختلاف اور علمی نزاع کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ صدر ایوب متذکرہ پیش لفظ میں فرماتے ہیں :

''معاشی اور سماجی میدانوں میں ہماری تمام کوششوں کا منتہائے مقصود پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے حصول کی طرف تیزی سے آگے بڑھنا ہی ہو سکتا ہے ۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح تقریباً '' رفاہی ریاست '' کا بدل ہے ۔ البتہ معروف رفاہی مقاصد کے علاوہ اسلامی سوشلزم کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ معاشی ترقی کی بے محابا دوڑ میں ملک کے ثقافتی اور مذہبی ورثے کو برباد نہ ہونے دیا جائے بلکہ اُسے قائم و برقرار رکھا جائے ۔ لہٰذا یہ تصور 'رفاہی ریاست' سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے ۔

''اسلامی سوشلزم کے قیام کی اساس دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں بلکہ سب کے لیے مساوی مواقع کی فراہمی پر ہے ۔ در حقیقت آمدنیوں میں مکمل مساوات تو کہیں بھی ، حتّٰی کہ کمیونسٹ ملکوں میں بھی ، حاصل نہیں ہوئی ہے ، کیونکہ اگر افراد برابر کے مواقع سے آغاز کریں ، جب بھی مزاج اور استعدادوں کے اختلاف کے باعث آمدنیوں کا فرق ناگزیر ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے ۔ جو بات ضروری ہے ، یہ ہے ، کہ ہر فرد کو اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دینے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیے اور کوئی غیر منصفانہ معاشی یا سماجی نظام اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے ۔

'' لہٰذا ہماری قطعی پالیسی ہوگی کہ آمدنی اور دولت کو چند ہاتھوں میں غیر معمولی طور پر اکٹھا ہونے سے روکیں اور معاشی مواقع کو وسیع پیمانے پر تقسیم کریں اور نجی کاروبار کو اس طرح ضابطے میں لائیں کہ تمام معاشرے کو اس سے فائدہ پہنچے ۔''

اگر کوئی سوال کرنے والا مجھ سے پوچھے کہ اسلامی سوشلزم کیا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جواب میں صدر ایوب کے ان الفاظ سے نہ ایک لفظ کم کہنا چاہوں گا ، نہ ایک لفظ زیادہ ۔ میرے نقطۂ نظر سے جس اسلامی سوشلزم کی پاکستان میں اس مرحلہ پر ضرورت

ہے اس کو نہایت عمدہ ، نہایت واضح اور کمال درستی کے ساتھ صدر ایوب کے متذکرہ پیش لفظ میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قوم میں اس احساس کو سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے بیدار کیا جائے جسکی توانا بیداری کے بغیر یہ ذمہ داری (یعنی اسلامی سوشلزم کے نصب العین کی طرف سے ہم پر عائد ہونے والی ذمہ داری) کماحقہ پوری نہیں ہو سکتی ۔

(۲)

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ کیا اسلامی سوشلزم کی ترکیب روحِ اسلام کے خلاف ہے ۔ اول تو آپ اسی بات پر غور فرمائیے کہ ہمارے بہترین دماغ اور ہمارے نہایت مخلص اور بیدار مغز قائدین جو اس وقت عالمِ اسلام میں موجود ہیں یا جو ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہیں ، انھوں نے پورے یقین و اعتماد اور کمال بصیرت کے ساتھ اس خیال اور ترکیب کو اختیار کیا ہے ۔ اس فہرست میں علامہ اقبال ، قائداعظم محمد علی جناح ، مرحوم لیاقت علی خان ، صدر ایوب ، صدر ناصر ، عراق کے صدر عارف ، الجزائر کے سابق صدر بن باللہ کے اسماء خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ۔ ان کے علاوہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے مصر ، شام ، لبنان ، عراق ، انڈونیشیا اور بھارت کے بیسیوں اہلِ نظر مسلمان اس تحریک اور ترکیب کے حامی اور علمبردار ہیں ۔ ہمارے ہاں کے علماء اور اربابِ فکر میں مولانا عبیداللہ سندھی ، چودھری افضلِ حق مرحوم ، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ، مولانا حسرت موہانی اور چراغ حسن حسرت کی تحریریں اس نقطۂ نظر سے توجہ اور التفات کے قابل ہیں ۔

یہاں میں ایک دلیل اور دینا چاہتا ہوں :

اسلامی تاریخ کے چودہ سو سال اس بات کے شاہد ہیں اور ہر زندہ اور دیرپا تحریک کے لیے یہ طرزِ عمل ناگزیر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نسلِ انسانی کے احوال میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اور جس قسم کا شعور کسی عہد میں بہ طورِ خاص ابھرتا ہے اور جس قسم کے ذہنی اور معاشرتی تقاضے کسی دور میں بنیادی اہمیت اختیار کرتے ہیں بقا کی آرزو مند تحریک ان کا خصوصی نوٹس لے اور اپنی تعلیمات کے اُس پہلو کو نمایاں طور پر سامنے لائے جو اُس دور کے تقاضوں اور شعور کو مطمئن کر سکتا ہو ۔

اگر کوئی مذہب یا تحریک ایسا کرنے میں ناکام رہے اور اپنی تعلیمات کے پیش کرنے میں عہد شناسی اور دور بینی کا ثبوت نہ دے تو وہ مذہب یا تحریک آئین فطرت کے مطابق اپنی موت مر جاتی ہے۔ اسلام اس لیے ایک زندہ اور جاوداں مذہب ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کی ہمہ گیری کی بدولت ہر عہد کی ضرورت اور ذوق کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنی اس صلاحیت کی وجہ سے وہ فرسودہ (Out of date) نہیں ہوتا۔

ہم سب اس سے واقف ہیں کہ اٹھارھویں اور بالخصوص انیسویں صدی میں جب انسانی شعور جمہوری قدروں اور اداروں کا گرویدہ اور پرستار ہوا تو مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے صدیوں تک بادشاہت کا دور دیکھنے کے باوجود یہ دعوٰی کیا کہ اسلام کا سیاسی نظام آمریت یا بادشاہت کی نسبت جمہوریت کے زیادہ قریب ہے اور یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے ''شُوریٰ'' کا جو اصولِ کار ہمیں دیا ہے اور خلافتِ راشدہ کا جو طریقِ کار تھا، اس میں جمہوریت کی روح کام کرتی تھی لہٰذا باوجود اس کے کہ ووٹ ڈالنے کا طریقہ، پارلیمنٹ بنانے کا ڈھنگ اور پارلیمانی حکومت کے بے شمار دوسرے پہلو قرآنِ حکیم میں بیان نہیں ہوئے، نہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں وہ معرضِ علم و عمل میں آئے، تاہم جمہوریت کی روح اور اصل چونکہ اسلام میں موجود ہیں اس لیے نئے جمہوری شعور کے سامنے ہم یہ کہنے اور اس پر زور دینے میں حق بجانب تھے کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوری ہے۔

اسی طرح اگرچہ ہم صدیوں تک جاگیرداری کا شکار رہے ہیں اور کچھ عرصے سے بعض اسلامی ملکوں میں سرمایہ داری بھی جڑ پکڑ رہی ہے تاہم جب بالآخر نسل انسانی کا معاشی شعور جاگ اٹھا ہے اور ہر طرف معاشی استحصال اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے اور مشرق و مغرب میں کروڑوں انسان دن رات معاشی انصاف اور معاشی عدل قائم کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہیں اور یہ دھن لوگوں کی سب سے بڑی دھن اور یہ شعور نسل انسانی کا سب سے گہرا شعور اور یہ تقاضا نوعِ بشر کا سب سے حساس تقاضا بن گیا ہے، ہم اس پیش منظر میں جب قرآنِ حکیم پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور رسولِ اکرمؐ کا عہد مبارک اور خلافتِ راشدہ کا مقدس دور نگاہوں میں لاتے ہیں تو ہماری خوشگوار

حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہ تعلیم اور یہ دور جسے ہم بے شمار اور پہلوؤں سے مثالی جانتے تھے ، معاشی انصاف اور مالی وسائل کی منصفانہ تقسیم کے اعتبار سے اور بھی مثالی اور حیات آفریں ہے ۔ اور لامحالہ ہمارے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اس دور میں ہم اسلامی تعلیمات کے اس پہلو پر خصوصی زور کیوں نہ دیں ، اسلام کے معاشی نقطۂ نظر کو نمایاں ، روشنی اور ظہور میں کیوں نہ لائیں اور اگر سو پچاس سال پہلے اسلام کو جمہوریت کہنا یا اسلام میں موجود جمہوریت پر زور دینا اسلام کی بہترین خدمت اور سچائی کا موزوں ترین اظہار تھا تو آج اسلام کی اشتراکیت یعنی اسلامی اشتراکیت پر زور دینا کیونکر اسلام کی بہترین خدمت اور سچائی کا بہترین اظہار نہیں ہوگا ۔ آئینِ بقا کا تقاضا ہے کہ یوں کیا جائے ۔ جو لوگ اسلامی جمہوریت یا اسلامی اشتراکیت ، جیسی ترکیبوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ چھلکوں پر نگاہ جمانے والے اور مغز سے صرفِ نظر کرنے والے ہیں ۔

(۵)

میں آخر میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا ۔ صدر ایوب کے متذکرہ پیش لفظ کے اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی سوشلزم کو ہم نے ایک قومی نصب العین قرار دے دیا ہے ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کا خاکہ مع اُس کے پیش لفظ کے اب ایک قومی اور سرکاری دستاویز ہے اور ہم بہ حیثیت فرد اور بہ حیثیت جماعت اور قوم کے اُسی کے پابندِ عہد ہیں ۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص اسلامی سوشلزم کو ہمارے ملک میں اسلام کے ساتھ فراڈ سے تعبیر کرے تو آپ کا کیا خیال ہے ایسا بیان اور بیان دینے والے کا یہ فعل انتہائی غیر ذمہ دارانہ نہیں ہے ؟

* * *

علامہ محمد اسد

اسلامی حکومت اور اقتصادی تحفظ

کسی قوم کی اخلاقی اور عمرانی اصلاح کی طرف مثبت تغیر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب قوم اس کی ضرورت سے باخبر ہو لہذا ہر صاحب فکر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے عمرانی ماحول پر گہری نظر رکھے اور مسلسل نکتہ چینی کرتے ہوئے عوامی بہبود کے لیے صدا بلند کرتا رہے۔ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا۔

> صرف دو قسم کے آدمی ہیں جن پر بجا رشک کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جسے خدا نے دولت عطا کی اور ساتھ ہی ہمت دے دی کہ اسے حق کی راہ میں خرچ کرے۔ دوسرا وہ جسے خدا نے حکمت دے دی، وہ اسی کے مطابق خود عمل کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دوسروں کودیتا ہے۔
>
> (بخاری و مسلم بہ روایت ابن مسعود)

نقد و مشورہ کا فرض — جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے شعور شہریت کے صحیح نشو و ارتقاء کے لیے حد درجہ ضروری ہے — ایک مسلم شہری کے نظریاتی واجبات پر ختم نہیں ہو جاتا، جو قوم کی طرف سے اس پر عائد ہیں۔ حقیقی اسلامی زندگی میں ان تمام معاملات کے متعلق مسلسل اجتہاد مضمر ہے اور اس کی ضرورت ہے، جن کا ذکر قانونی حیثیت سے قرآن و سنت کے یقینی اور واضح نصوص میں نہیں آیا اور اجتہاد کی آزادی اس وقت اقتصاری و عمرانی فرض بن جاتی ہے، جب اجتماعی مسائل زیر بحث ہوں — یہ بالفاظ دیگر ملت کے مذہبی لیڈروں پر اخلاقاً واجب ہے کہ اجتماعی ترقی کے لیےجو نئے افکار انھیں سوجھیں، انھیں پیش کریں اور عوام کے روبرو ان کی وکالت کرتے رہیں۔

مفت اور لازمی تعلیم

حکومت کی سرگرمیوں پر خاص توجہ رکھنے کے سلسلے میں شہری

کے فرائض کی ایک منطقی شق یہ ہے کہ اسے آزادیٔ رائے اور آزادی اظہار کا حق حاصل ہے جسے اسلام نے ملت کے تمام بالغ افراد کے لیے محفوظ کر دیا ہے ، لیکن اظہار رائے کا حق اور فرض بالکل بے معنی رہ جائے گا — اور بعض اوقات معاشرے کے بہترین مفاد کے لیے نقصان رساں ہو جائے گا — اگر ظاہر کردہ آراء فکرِ محکم پر مبنی نہ ہوں ۔ اس کا مطلب یہ ہؤا کہ ہر فرد کو پختہ علم حاصل ہونا چاہیے ، لہذا شہری کا حق ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ ایسا نظام تعلیم مہیا کرے جس کے ذریعے سے مملکت کے تمام مرد و زن مفت تعلیم پا سکیں — قرآن و سنت تحصیل علم کے متعلق احکام سے لبریز ہیں اور رسول اللہ (صلعم) نے بے شمار مواقع پر علم کی اعلٰی قدر و قیمت کی تصریح فرمائی ہے مثلاً :

اگر کوئی شخص علم کی تلاش میں راستہ اختیار کرتا ہے تو خدا اس کی برکت سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا ۔
(مسلم بہ روایت ابوہریرہ)

عالم کو صرف عبادت گزار پر وہی فضلیت حاصل ہے جو چودھویں کے چاند کی رات ، چاند کو ، تمام دوسرے ستاروں پر حاصل ہوتی ہے ۔
(ترمذی ، ابوداؤد اور احمد بن حنبل بہ روایت ابودرداء)

مزید فرمایا :

عالم کو نرے عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے تم میں سے کسی عامی آدمی پر ہے ۔
(ترمذی بہ روایت ابوامامہ الباہلی)

علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے ۔
(ابن ماجہ بہ روایت انس)

نتیجہ یہ ہؤا کہ مملکت دعوتِ اسلام کی بنا پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے اور زیرِ اقتدار خطوں میں شریعتِ اسلام قائم کرنا چاہتی ہے ۔ اس کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف تعلیم کا انتظام کرے بلکہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے تحصیلِ علم لازم کردے ۔ ایسی مملکت کے بنیادی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زندگی کی ایسی تمام سہولتیں غیر مسلم شہریوں کے لیے بھی مہیا کرے ۔ گویا تعلیم تمام شہریوں کے

لیے مفت اور لازمی ہونی چاہیے خواہ ان کا مذہب کچھ ہو -

اقتصادی تحفظ

شہریت کی کامل اطاعت کے دعوے کے لیے وجہ جواز مہیا کرنے کی غرض سے مملکت کو شہریوں کی مادی بہبود کی ذمہ داری سرگرمی سے سنبھالنی چاہیے - دوسرے لفظوں میں مملکت کی ذمہ داری ہے کہ شہریوں کے لیے ایسی اقتصادی سہولتیں بہم پہنچائے جو انسانی راحت و وقار قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوں - اس اصول کی توضیح کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ (صلعم) کا مندرجہ ذیل ارشاد پیش نظر رکھ لیا جائے :

> دیکھو ، تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر شخص اپنے ریوڑ کے لیے ذمہ دار ہے - اسی طرح امام (یعنی حکومت) جو لوگوں پر مقرر ہوا ہے چرواہا ہے اور اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے اور ہر مرد اپنے کنبے کے لیے چرواہا ہے اور اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے - عورت اپنے شوہر کے گھر بار اور بچوں کے لیے چرواہی ہے ، وہ بھی اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے - ملازم اپنے آقا کی جائداد کے لیے چرواہا ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے - دیکھو ، تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر شخص اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے -
>
> (بخاری و مسلم بہ روایت عبداللہ بن عمر)

خوانندۂ کتاب نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس حدیث میں شہریوں کے لیے حکومت کی ذمہ داری کو بچوں کے لیے باپ یا ماں کی ذمہ داری کے برابر رکھا گیا ہے - جس طرح باپ چرواہا ہے ، یعنی محافظ و مربی ، اخلاقاً اور قانوناً وہی کنبے کی کفالت و بہبود کا ذمہ دار ہے ، اسی طرح حکومت بھی اخلاقاً اور قانوناً شہریوں کی اقتصادی بہبود کی ذمہ دار ہے ، جن کے معاملات کا انتظام اس کے حوالے ہوا ہے - اس کا فرض ہے کہ خیال رکھے ، کسی شخص کا معیارِ معیشت منصفانہ سطح سے نیچے نہ گرنے پائے - اگرچہ اسلام نے واضح کر دیا کہ انسانی زندگی محض جسمانی زندگی تک محدود نہیں — زندگی کی علت غائی اصلاً روحانی ہے — مسلمان کو حق حاصل ہے

کہ روحانی حقائق و اقدار کو انسانی زندگی کے جسمانی عوامل سے الگ نہ سمجھے ۔ غرض اسلام ایک ایسے معاشرے کا متقاضی ہے، جو صرف اخلاقی نقطۂ نگاہ ہی سے راستباز نہیں ، بلکہ عملاً بھی راستبار ہے ــ ایک ایسا معاشرہ ، جو اپنے افراد کے لیے صرف روحانی ضرورتوں ہی کا کفیل نہیں ، بلکہ جسمانی ضرورتوں کا بھی ذمہ دار ہے ــ غرض مملکت اسی صورت میں حقیقۃً اسلامی بن سکتی ہے کہ ملت کے معاملات کا انتظام ایسے طریق پر کیا جائے ، جس میں ہر فرد ، مرد ہو یا عورت ، اقل مالی بہبود سے مستفید ہوسکے ، یعنی وہ بہبود ، جس کے بغیر نہ انسانی شرف باقی رہتا ہے ، نہ حقیقی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اور سب سے آخر میں یہ کہ نہ روحانی ترقی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یقیناً یہ نہیں کہ مملکت کو تمام شہریوں کے لیے سہل اور بے خلش زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دینا چاہیے۔ نہ کوئی مملکت ایسا کریگی نہ کر سکتی ہے ۔ اس کا مطب صرف یہ ہے کہ اولاً اسلامی مملکت میں فراوانی کے پہلوبہ‌پہلو روح فرسا افلاس نہ ہونا چاہیے۔ ثانیاً مملکت کے تمام وسائل سے اس طرح کام لینا چاہیے کہ تمام شہریوں کے لیے روزگار کے مناسب وسائل مہیا ہو جائیں۔ ثالثاً ایسے تمام مواقع تمام شہریوں کو حاصل رہنے چاہیں اور کسی شخص کو یہ موقع نہ دینا چاہیے کہ دوسروں کے نقصان پر اعلیٰ معیارِ معیشت حاصل کر لے ۔

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا :

> ایک صاحبِ ایمان اور دوسرے صاحبِ ایمان کی مثال ایک عمارت کے حصوں کی سی ہے ۔ ہر حصہ دوسرے کے لیے وجہِ تقویت ہے ۔
>
> (بخاری و مسلم بہ روایت ابوموسی)

یوں ہر دائرۂ حیات میں تعاون اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اور کوئی مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی ، جب تک وہ قانونی ذرائع سے اس تعاون کو جاری نہ کرے اور اس طرح شہریوں کو ان اسلامی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے ، جو رسول اللہ (صلعم) کے ارشادات پر مبنی ہیں :

> تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ اور

ایمان نہیں پا سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو۔
(مسلم بہ روایت ابوہریرہ رض)

جو روئے زمین پر ہیں ان کے ساتھ رحم سے پیش آؤ ، جو آسمان پر ہے وہ تمہارے ساتھ رحم سے پیش آئے گا۔
(ترمذی وابوداؤد بہ روایت عبداللہ بن عمر)

جو لوگوں کے ساتھ رحم سے پیش نہیں آتا ، خدا اس کے ساتھ بھی رحم سے پیش نہ آئے گا۔
(بخاری و مسلم بہ روایت جریر بن عبداللہ)

اور یہ ارشاد پیش نظر رکھیے :

اگر کوئی مسلمان کسی برہنہ مسلمان کو لباس پہنائے گا خدا اسے جنت کی تازگی و آبداری کا لباس پہنائے گا۔ اگر کوئی مسلمان ایک بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا خدا اسے جنت کے پھل کھلائے گا۔ اگر کوئی مسلمان پیاسے مسلمان کو پانی پلائے گا تو خدا اسے ایسا مشروب پلائے گا جس پر مہر لگی ہوگی یعنی (مشروب جنت)۔ (ترمذی و ابوداؤد بہ روایات ابو سعید)

سب سے آخر میں یہ ارشاد ملاحظہ کیجیے :

وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں کہلا سکتا ، جو خود پیٹ بھر کر کھا لے اور اس کے پہلو میں ہمسایہ بھوکا ہو۔
(بیہقی بروایت ابن عباس)

رسول اللہ (صلعم) کے پیروؤں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضورؐ نے صرف انفرادی حیثیت میں خیرات کی تاکید فرمائی ۔ حضورؐ نے اجتماعی اعتبار سے بھی باہم امداد اور تعاون پر زور دیا ، فرمایا :

تمام مومن ایک فرد کی طرح ہیں ۔ اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہو تو پورے جسم کو تکلیف ہوگی ۔ اگر سر درد کرے تو پورا جسم درد میں مبتلا ہوگا ۔ (مسلم بہ روایت نعمان بن بشیر)

مومنوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ باہم محبت ، ہمدردی اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح ہیں ۔ اگر ایک عضو تکلیف میں ہو تو پورا جسم بے خوابی اور بخار سے تکلیف اٹھاتا ہے ۔
(بخاری و مسلم بہ روایت نعمان بن بشیر)

یہ اسلام کا نہایت اہم اجتماعی سبق ہے کہ وہ معاشرہ کبھی راحت و قوت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا ، جس کے بعض افراد تو انتہائی احتیاج کا شکار ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے پاس ضرورت سے زیادہ سر و سامان جمع رہتا ہے ۔ اگر پورا معاشرہ غیر معمولی حالات کے باعث (جیسے اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کو پیش آئے تھے) مبتلائے مصائب ہو تو یہ مصائب روحانی قوت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں اور یوں آئندہ عظمت و برتری کا دروازہ کھلتا ہے ۔ اس کے برعکس اگر قوم کے مہیا وسائل غیر مساوی طریق پر منقسم ہوں ، بعض گروہوں کو فراوانی حاصل ہو اور قوم کی اکثریت کو قوتِ لا یموت کی خاطر اپنی تمام قوتیں صرف کرنی پڑیں تو افلاس روحانی ترقی کا نہایت خوفناک دشمن بن جاتا ہے اور بعض اوقات یہ صورتِ حال پوری جماعتوں اور قوموں کو خدا آگاہی سے دور لے جاتی ہے اور اس مادیت کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے جہاں روح برباد ہو جاتی ہے ۔ رسول اللہ (صلعم) نے جب یہ الفاظ فرمائے تو غالباً حضورؐ کے سامنے یہی حقیقت تھی ، فرمایا :

افلاس بعض اوقات کفر بن جاتا ہے ۔ (سیوطی : الجامع الصغیر)

افراط کے عین درمیان میں افلاس کا وجود مواخات کے اس اصول کی نفی ہے ، جو اسلام کی دعوت کا مبنی ہے ۔ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا :

> اس ذات پاک کی قسم ، جس کے قبضے میں میری جان ہے ، کوئی شخص اس وقت تک پورا ایمان دار نہیں ہو سکتا ، جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے ، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے ۔ (بخاری و مسلم بہ روایت انس)

لہٰذا اسلامی مملکت کو چاہیے کہ قوم کے اندر حق و انصاف رواج پائے اور ہر شہری — مرد ، عورت اور بچے — کے پاس کھانے اور پہننے کے لیے ضروری سامان ہونا چاہیے ۔ بیماری میں اس کی امداد کی جائے ۔ رہنے کے لیے اس کے پاس موزوں مقام ہو ۔ اس مقصد کی تکمیل کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے دستور میں چند دفعات اس مضمون کی شائع کر دی جائیں کہ ہر شہری کو حق حاصل ہے :

(الف) جب تک کام کرنے کی عمر ہو اور صحت اچھی ہو ، اسے بار آور اور منفعت بخش کام ملے ۔

(ب) اس بار آور کام کے لیے حسب ضرورت تربیت مملکت کے خرچ پر دی جائے۔

(ج) بیماری کی حالت میں مفت اور ہر وقت طبی خدمت کا انتظام کیا جائے۔

(د) اگر کوئی شخص بیماری کے باعث کام کرنے کے قابل نہ رہے یا کوئی عورت بیوہ ہو جائے یا ایسے حالات میں بے روزگاری کا موقع آ جائے، جو انفرادی دسترس سے باہر ہوں، مثلاً بڑھاپا یا کمسنی تو مملکت کھانے پینے، پہننے اور رہنے سہنے کا پورا انتظام کر دے۔

ایسے دستوری قانون کا مطلب یہ ہوگا کہ قومی پیمانے پر اجتماعی بیمے کے منصوبے (سوشل انشورنس سکیم) کا انتظام کیا جائے اور اس منصوبے کے لیے اربابِ ثروت پر مناسب محاصل عائد کیے جائیں۔ یہ محاصل رسول اللہ (صلعم) کے ارشاد کے عین مطابق ہوں گے۔ فرمایا:

(روپیہ) دولت مندوں سے لیا جائے اور غریبوں کی طرف لوٹا دیا جائے۔ (بخاری بہ روایت عبداللہ بن عباس)

اس کے لیے زکٰوۃ کے علاوہ جائداد پر محصول عائد کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ (صلعم) کا ارشاد ہے:

زکٰوۃ کے علاوہ جائداد پر بھی ایک محصول (حق) ہے۔
(ترمذی و ابن ماجہ بہ روایت فاطمہ بنت قیس)

اگر بعض خوانندگان کتاب کا احساس یہ ہو کہ اجتماعی بیمے کے منصوبے کا خیال بیسویں صدی کی ایجاد ہے تو میں انھیں یہ حقیقت یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ منصوبہ صدیوں پیشتر رائج تھا، البتہ اس نے یہ نام نہیں پایا تھا اور نہ اس کی ضرورت نمایاں ہوئی تھی، جو دور حاضر کے صنعتی تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔ یہ منصوبہ خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی دولت مشترکہ کے اندر مرجود تھا۔ حضرت عمر اعظمؓ نے ۲۰ھ (۶۴۱ء) میں حکومت کا ایک خاص محکمہ قائم کیا تھا، جسے دیوان کہتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً مردم شماری کرائی جائے۔ اس مردم شماری کی بنا پر مندرجہ ذیل کے لیے مملکت کی طرف سے سالانہ

پنشنیں مقرر ہوتی تھیں :

(الف) بیوہ عورتیں اور یتیم بچے ۔

(ب) وہ تمام افراد ، جو رسول اللہ (صلعم) کے عہد مبارک میں اسلام کے لیے علمدار جہاد رہے ، مثلاً ازواج مطہراتؓ ، شرکائے بدر میں سے باقی ماندہ اصحابؓ ، ابتدائی مہاجرینؓ وغیرہ ۔

(ج) تمام اپاہج ، بیمار اور بوڑھے ۔

اس منصوبے کے تحت کم سے کم وظیفہ اڑھائی سو درہم سالانہ تھا ۔ پھر ایک باقاعدہ وظیفہ بچوں کے لیے مقرر ہو گیا ، جو ان کے والدین یا سر پرستوں کو دیا جاتا (اصول یہ تھا کہ وہ اپنے لیے روزی مہیا نہیں کر سکتے) اور یہ وظیفہ پیدائش سے بلوغ تک برابر جاری رہتا ۔ حضرت عمرؓ نے زندگی کے آخری سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ فرمایا : ''اگر خدا نے مجھے زندگی کی مہلت عطا کی تو میں ایسا انتظام کردوں گا کہ صنعا کے پہاڑوں میں تنہا رہنے والا گڈریا بھی قوم کی دولت سے حصہ حاصل کرے ۔''

حضرت عمرؓ ہر معاملے کے عملی پہلوؤں پر خصوصی نظر رکھتے تھے ، چنانچہ انھوں نے آدمیوں کی ایک جماعت پر تجربہ شروع کر دیا کہ صحت و قوت بحال رکھنے کے لیے آدمی کو بالاوسط کم سے کم کتنی خوراک درکار ہے ۔ ان تجربات کے بعد حکم دے دیا کہ مالی وظیفے کے علاوہ ہر مرد اور عورت سرکاری انبار خانوں سے گندم کی ایک مقدار ماہانہ وصول کرے ، جس سے یومیہ دو وقت کی خوراک تیار ہو سکے ۔ (طبقات ابن سعد جلد ۳ حصہ اول صفحہ ۱۲۹-۲۲۰)

حضرت عمرؓ اجتماعی بیمے کا یہ عظیم الشان منصوبہ مکمل نہ کر سکے اور آپ نے ایک قاتل کے ہاتھوں شہادت پائی ۔ آپ کے جانشینوں میں نہ وہ وسعتِ نظر تھی اور نہ ویسی انتظامی صلاحیت کہ ان کے نامکمل کام کو جاری رکھتے ۔

یہ دیکھیے ، اسلامی تاریخ کے بہت سے دوسرے مواقع کی طرح یہاں بھی ایک شاندار آغاز نذرِ فراموشی ہوگیا ۔ اس سے اسلام کو ، نیز پیروان اسلام کے عمرانی نشو و ارتقاء کو نقصان پہنچا ۔ ہمارے سامنے تیرہ سو سال کا تاریخی تجربہ ہے ۔ پھر کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ اس شرمناک

تغافل کی تلافی کریں اور حضرت عمرؓ کے شروع کیے ہوئے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں ۔ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا :

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا : اے آدم کے بیٹے ! میں بیمار ہو گیا تو نے میری عیادت نہ کی ۔" آدمی کہے گا : " یا اللہ ! میں تیری عیادت کس طرح کرتا تُو تو جہانوں کا پروردگار ہے ۔" خدا جواب دے گا : "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے بندوں میں سے فلاں اور فلاں بیمار تھے ، تو نے ان کی عیادت نہ کی ؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو نے عیادت کی ہوتی تو مجھے بھی بیمار کے پاس پاتا ؟ پھر اے آدم کے بیٹے ! میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے نہ دیا ۔" آدمی کہے گا : " یا اللہ ! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا ، تُو تو جہانوں کا پروردگار ہے ۔" اس پر خدا فرمائے گا : "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے بندوں میں سے فلاں فلاں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے انہیں نہ کھلایا ، کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو انہیں کھانا کھلا دیتا تو مجھے بھی ان کے پاس پاتا ؟ پھر اے آدم کے بیٹے ! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے نہ پلایا ۔" آدمی کہے گا : " بار الٰہ ! میں تجھے پانی کیونکر پلاتا ، تُو تو جہان کا پروردگار ہے ۔" خدا فرمائے گا : "میرے فلاں اور فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے انہیں پانی نہ پلایا ، کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو کسی کو پانی پلاتا تو مجھے بھی اس کے پاس پاتا ؟ "

ترجمہ : مولانا غلام رسول مہر

(بہ شکریہ : شیخ غلام علی اینڈ سنز)

* * *

زندہ کتابیں

اردو میں کم خرچ کاغذی کتابوں (پاکٹ بکس) کا سب سے معیاری سلسلہ

تاریخ و سوانح

خانۂ کعبہ — طاہرالکردی — 1.75
محمد رسول اللہ — توفیق الحکیم — 5.00
دس پیغمبر — بشیر احمد سعدی — 2.50
دس ولی — بشیر احمد سعدی — 2.00
الحسن و الحسین — محمد رضا مصری — 3.00
عثمان بن عفان — محمد رضا مصری — 4.00
قلوپطرہ کی کہانی — قاسم محمود — 1.50
صلاح الدین ایوبی — ابوفرید الحدید — 3.00

شفیق الرحمٰن

کرنیں — شفیق الرحمٰن — 2.50
شگوفے — شفیق الرحمٰن — 2.50
پچھتاوے — شفیق الرحمٰن — 2.50
مد و جزر — شفیق الرحمٰن — 2 00

شکاریات

ردرپریاگ کا آدم خور — جم کاربٹ — 2.00
شیرآیا، شیرآیا — کاربٹ، اینڈرسن — 3.25

دنیا کا بہترین ادب

مادام بوواری (ناول) — فلوبیر — 4.00
سرخ و سیاہ (ناول) — ستاں دال — 7.00
بوڑھا اور سمندر (ناول) — ہیمنگوے — 1.50
بڈھا گوریو (ناول) — بالزاک — 3.50
پیار کی دیوی (ناول) — پئر لوئی — 2.75
امید پرست (ناول) — والتیر — 2.00
جہاں گرد کی واپسی (ناول) — ہومر — 6.00
مرتبہ : رحیم

کامیاب زندگی

باز آؤ اور زندہ رہو — حنیف رامے — 3.00
جینے کا قرینہ — آندرے موروا — 3.00
اپنا راستہ خود بناؤ — فائق کامران — 2 50
کیا آپ کاروبار کرتے ہیں — اعجاز حسین — 2.75
آداب زندگی — محمد اقبال سلیمان — 2.00
نفسیات سب کے لیے — محمد اقبال سلیمان — 1.50
عورت، جنس اور جذبات — سلیم اختر — 2.00
زندگی کا راستہ — چیسر — 3.00
کامیابی کا راستہ — چیسر — 2.25

معلومات

روزمرہ آداب — الطاف فاطمہ — 2.00
امتحانوں کی تیاری — وڈلے — 1.50
بین الاقوامی معلومات — محمد اکرام رہبر — 4.00
اقتصادی ترقی — گالبریتھ — 1.75

اردو ادب

خالی بوتلیں خالی ڈبے — منٹو — 2.50
چغد — منٹو — 2.50
یزید — منٹو — 2.50
شکست کے بعد — کرشن چندر — 2.50
شبنم (ناول) — عزیز احمد — 3.00
گریز (ناول) — عزیز احمد — 3.00
ایک محبت سو افسانے — اشفاق احمد — 2.75
۱۹۶۳ کے بہترین افسانے — 4.00
۱۹۶۳ کے بہترین مقالے — 2.50
۱۹۶۵ء کے بہترین افسانے — 3.50
۱۹۶۵ء کے بہترین مقالے — 3.00
۱۹۶۵ء کی بہترین شاعری — 2.00
رستم و سہراب (ڈراما) — آغا حشر — 1.50
دیوان شیفتہ — مصطفٰے خان شیفتہ — 4.00

البیان، چوک انارکلی، لاہور-۸

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

ملکیتِ زمین

اگر ایک بچے کے پیدا ہوتے ہی اسے بدل کر دوسرا بچہ رکھ دیا جائے اور والدین کو بالکل خبر نہ ہو تو والدین اسے اپنی اولاد سمجھ کر پرورش کرتے رہیں گے اور بچہ بھی ان کو اپنے والدین تصور کرتا رہے گا، حالانکہ والدین بھی جعلی ہیں اور بچہ بھی نقلی ہے۔ ذرا سوچیے کہ والدین اور اولاد کے درمیان یہ محبت کیوں ہے؟ کیا یہ محبت محض پرورش کی محبت ہے؟ جی نہیں، دراصل اس کے اندر ایک بہت بڑا نفسیاتی نکتہ کار فرما ہے اور وہ یہ ہے کہ ''یہ میرا بچہ ہے، یہ میرے والدین ہیں۔'' اگر بڑے ہونے کے بعد والدین و اولاد کو یہ علم ہو جائے کہ یہ رشتہ بالکل فرضی اور جعلی ہے تو یقین کیجیے کہ اس وقت سے طرفین کی پدری و پسری الفت میں ایک نمایاں شگاف پیدا ہو جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ یہاں بھی وہی نفسیات کارفرما ہے۔ اسے ''میرے اور تیرے'' کی نقلی بازی گری کہیے یا کچھ اور کہہ لیجیے۔

ایک اور مثال لیجیے۔ دنیا کے بنکوں میں اربوں روپیہ جمع ہے، مگر آپ کو نہ اس کے ہونے کی خوشی ہے نہ جلنے کا غم ہے، لیکن تھوڑی سی رقم آپ کے ہاتھ آ جائے یا ہاتھ میں بھی نہ آئے، صرف بنک میں آپ کے نام سے جمع کر دی جائے، تو اس سے آب کو ایک شادمانی اور سرور پیدا ہوگا اور اگر وہ ضائع ہو جائے تو آپ کو رنج و افسوس بھی ہوگا۔ یہاں یھی وہی ''میرے تیرے'' کے فرق کا کھیل ہے۔ انسان کی فطرت میں ابھی تک ''میرے تیرے'' کا فرق موجود ہے اور وہ منزل ابھی دور ہے، جہاں پہنچ کر کاروانِ انسانیت اس فرق کو یکسر فراموش کر دے۔

ملکیت کے تصور کا آغاز دراصل اسی ''میرے تیرے'' کے فرق سے ہوتا ہے۔ جہاں یہ فرق ہے وہاں ملکیت اور عدم ملکیت کا سوال بھی پیدا ہوگا اور جہاں وہ نہیں وہاں یہ بھی نہیں ہے۔ اب بھی دیکھ لیجیے، اگر ایک سڑک پر آپ جا رہے ہوں، اسی پر کوئی دوسرا بھی چل

رہا ہو، تو آپ کو کوئی رنج نہیں ہوتا۔ ایک نہر کے کنارے آپ ہاتھ منہ دھو رہے ہوں اور دوسرا دوسرے کنارے پر پانی استعمال کر رہا ہو، تو آپ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ ہوا کا جو جھونکا آپ کی سانس کے ساتھ پھیپھڑے میں جا رہا ہے، اسی جھونکے سے کوئی دوسرا بھی سانس لے رہا ہو تو آپ کو کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ ایسی ایسی ہزاروں قدرتی اور مصنوعی چیزیں، مسجد سے لے کر پارک تک ہیں، جن کو ہر شخص استعمال کرتا ہے، لیکن کوئی ایسا نہیں، جسے دوسرے کے استعمال سے تکلیف ہو اور باہمی پیکار ہو۔ آپ سمجھے ایسا کیوں ہے؟ بات صرف اتنی ہے کہ ان چیزوں پر ''میری تیری'' یعنی ''ملکیت'' کا کوئی ٹھپہ نہیں لگا ہوا۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ ''مشترک ملکیت'' ہے۔ جھگڑا صرف وہیں ہوتا ہے جہاں میرے اور تیرے کا سوال پیدا ہو۔ مشترک چیزوں میں بھی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اسی وقت جب کہ ان کے اندر میرے تیرے کی سی کوئی شکل پیدا ہونے لگے۔ ہر انسان فطرتاً اپنے ''میرے'' کی حدود کو وسیع کرنا چاہتا اور دوسرے کے ''تیرے'' کا دائرہ تنگ کرنا چاہتا ہے۔ یہی فساد کی جڑ ہے۔

اب غور سے دیکھیے کہ ''میرے تیرے'' کا جذبہ انسانی فطرت میں موجود ہے، جو ابھی مٹایا نہیں جا سکتا اور جہاں یہ جذبہ موجود ہو، وہاں فتنہ و فساد ہوتا ہے۔ اگر اس فرق من و تو کے جذبے کو مٹائیے تو یہ فطرتِ انسانی سے جنگ ہوگی اور اس کو باقی رکھیے تو فساد کا دائرہ وسیع تر ہوگا۔ پھر کیا کیا جائے؟ اس کا حل نہ روس کے پاس ہے، نہ امریکہ کے پاس۔ رہے اسلامی ممالک، تو وہ کسی شمار میں نہیں۔

اس کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ ہم جب اسلام کا لفظ بولیں تو آپ اس سے مراد صرف کتاب و حکمت سمجھیے — حکمت بڑی وسیع حقیقت کا نام ہے، تاہم اتنا سمجھ لیجیے کہ سچی حقیقت کے انکشاف یا اس کی صحت و سقم معلوم کرنے کے لیے آپ کو جس عقلی کسوٹی کی ضرورت پڑتی ہے اسی کا نام حکمت ہے اور یہ جہاں بھی ہو، اسے مومن ہی کی گم شدہ دولت سمجھنا چاہیے۔

اب آئیے، پہلے کتاب اللہ کو دیکھیں، لیکن یہ واضح رہے کہ صرف لغت، تاریخ، صرف و نحو، بلاغت و معانی اور ادب وغیرہ سے کتاب اللہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ فہم قرآن کے لیے سب سے

زیادہ ضروری حکمت ہے ، جسے قرآن کے ساتھ ساتھ ہی رکھا گیا ہے۔ قرآن کے فقط احکام کو دیکھ کر اس کا ترجمہ سمجھ لینا یا اس کی شانِ نزول کو جان لینا کافی نہیں ۔ اس سے زیادہ ضروری یہ جاننا ہے کہ قرآن چاہتا کیا ہے ، مثلاً قرآن نے کچھ سزائیں بتائی ہیں تو اس کا یہ منشا نہیں کہ ان سزاؤں کو وہ باقی رکھنا پسند کرتا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ دنیا سے جرائم کا خاتمہ ہو جائے تاکہ ان سزاؤں کی ضرورت ہی نہ پڑے ۔ ہر قانون کے پس پردہ اس کی ایک روح ، ایک منشا ایک غایت اور ایک مقصد ہوتا ہے جسے Spirit یا Preamble کہتے ہیں ۔ تفریعی قانون بناتے وقت اس مقصد کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

ملکیت زمین کے متعلق نفیاً یا اثباتاً ہمیں ایسی کوئی آیت قرآنی نہ مل سکی جس کا مفاد یہ ہو کہ الملک حق (ملکیت برحق ہے) یا الملک باطل (ملکیت کا تصور باطل ہے) ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسا کوئی مسئلہ ہی نہیں جس کو دین یا شریعت کے اقدار مستقلہ میں شمار کیا جا سکے ہاں بعض لوگوں نے ملکیت زمین کے لیے یہ اشارہ قرآن سے نکالا ہے کہ اگر ملکیت کو نہ تسلیم کیا جائے تو قرآن کا قانونِ وراثت ختم ہو جائے گا ۔ مگر یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں جرائم ضرور باقی رہنے چاہییں ورنہ قرآن کا قانونِ حدودِ تعزیرات ختم ہو جائے گا ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حدود و تعزیرات کا مقصد خود تعزیرات و حدود کو باقی رکھنا نہیں بلکہ جرائم کو ختم کرنا ہے اسی طرح قانون وراثت کا مقصد بھی ملکیت کی تصدیق (Confirmation) نہیں بلکہ تصور ملکیت کو بتدریج ختم کرنا ہے ۔ اگر صاف و صریح لفظوں میں بھی قرآن ملکیت کی تصدیق کرتا جب بھی ہمیں محض قانون نہیں بلکہ اس کی روح اور اسپرٹ دیکھنی پڑتی ہے چہ جائیکہ اس صورت میں جب کہ قرآن اس معاملے میں خاموش ہے ۔ اس خاموشی کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس کا شمار اقدار متغیرہ میں ہے جو ایک عبوری دور کی چیز ہے ۔ ہمیں حکمت سے کام لینا چاہیے یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآنی رجحان اس معاملے میں کیا ہے اور وہ چاہتا کیا ہے ؟

ابھی آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ تصور ملکیت کا آغاز ہی "میرے اور تیرے" کے فرق سے ہوتا ہے اور یہ انسانی فطرت میں داخل ہے ۔

دوسری طرف آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرما لیا کہ دنیا کے سارے فسادات ''میرے تیرے'' ہی کے جذبے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر فطرت سے جنگ کی جائے تو مشکل اور اس فطرت کو باقی رکھا جائے تو دشواری— یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس باب میں عجیب متوازن راہ اختیار فرمائی ہے۔

اسلام دین فطرت ہے لہذا اس فطرت انسانی سے اس نے اعراض نہیں برتا ہے مگر وہ فطرت کو بے لگام بھی نہیں چھوڑتا؛ وہ فطرت کو سقیم ہونے کے بجائے سلیم بناتا ہے، فطرت کو ختم نہیں کرتا۔ فاطرالسمٰوت والارض نے انسان کی فطرت میں جنسی قوت دی ہے لیکن وہ نہ اسے ختم کراتا ہے نہ اسے بے لگام چھوڑتا ہے بلکہ اس فطری قوت کا صحیح استعمال بتاتا ہے اور اسے سلامتی کی راہ پر لگاتا ہے۔ انسانی فطرت میں جنگ و پیکار بھی ہے؛ اسلام اسے بھی صحیح راستے پر لگاتا ہے۔ غرض ہر قوت کا صحیح استعمال بتاتا ہے، اسے فنا نہیں کرتا۔ تصور ملکیت کا بھی یہی حال ہے۔ اسے بھی اسلام ختم نہیں کرتا کیونکہ اگر اسے ختم کر دیا جائے تو انسان کمانا چھوڑ دے۔ اس وقت تو انسان کماتا ہی اس جذبے سے ہے کہ ہم جو کچھ کمائیں گے وہ ''ہمارا'' ہوگا اور ہم اسے اپنی مرضی سے تصرف میں لا سکیں گے۔ قرآن اس فطرت کا احترام کرتے ہوئے اسے باقی رکھتا ہے۔

لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام فسادات کی جڑ بھی ''میرے تیرے'' کا فرق ہے یعنی ملکیت کی بڑھتی ہوئی خواہش اور اسے بھی دبانا ضروری ہے۔

اسلام نے ان دونوں حقیقتوں میں توازن و اعتدال پیدا کرنے کے لیے:

(۱) پہلے تمام ناجائز ذرائع آمدنی پر قدغنیں بٹھا دیں تاکہ ملکیت کی بڑھتی ہوئی خواہش دب جائے۔

(۲) انفاق کی ہر ممکن ترغیب بھی دی اور حکم بھی دیا مگر ناجائز راہوں میں انفاق کو روک دیا۔

(۳) ملکیت کے جذبے کو بتدریج ختم کیا تاکہ جیسے جیسے یہ جذبہ کم ہوتا جائے ویسے ویسے فسادات کی راہیں بھی مسدود

ہوتی جائیں ۔

پہلی دو شقوں کی تفصیل آپ کو میرے ایک مقالے میں ملے گی جس کا عنوان ہے ''اخلاق اور معاش کا باہمی ربط ۔'' تیسری شق کے لیے پہلے ایک حدیث سنیے :

میرے لیے زمین کو پاک کرنے والا اسے مسجد بنا دیتا ہے ۔

مسجد کیا ہے ؟ اہل اسلام کا سوشل مرکز ہے ۔ مسجد کا مقصد یہ نہیں کہ جو کچھ یہاں ہوتا ہے وہ باہر نہ ہو ۔ یہاں مناسک صلٰوۃ ادا کیے جاتے ہیں ۔ تنظیم ، اتحاد ، مساوات وغیرہ کے سبق ملتے ہیں ، یاد الٰہی اور خدا ترسی کی مشق ہوتی ہے ۔ لیکن یہ ساری باتیں اس لیے نہیں ہوتیں کہ ہمیشہ یہ مسجد کی حدود میں بند رہیں بلکہ ان سے غرض ہی یہ ہے کہ یہ تمام اقدار مسجد کی چار دیواریوں سے باہر بھی ہوں اور پورے کرۂ ارض میں پھیل جائیں ۔ ٹھیک اسی طرح مسجد کی ایک خاص خاصیت یہ ہے کہ وہ ہوا ، پانی ، سورج وغیرہ کی طرح کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی ۔ ہر شخص کا اس میں یکساں حق ہے ۔ اس تصور کو بھی مسجد کی چہار دیواریوں سے نکل کر ساری زندگی اور پورے خاکدانِ ارض پر محیط ہو جانا چاہیے ۔ اس حدیث کے آگے کا مضمون یہ ہے کہ :

لہذا جس پر جہاں وقت نماز آ جائے وہیں وہ اسے ادا کرے ۔

(او کما قال)

سوچیے ، نماز جب مسجد سے باہر پڑھی جائے گی تو کیا اس میں اجتماعیت ، تنظیم ، مساوات ، ذکر الٰہی وغیرہ نہیں ہوں گے ؟ وہ سب کچھ ہوگا جو مسجد کے اندر ہوتا ہے ۔ یوں ہی پورے کرۂ ارض کو بھی مسجد کی طرح سب کی مشترک ملکیت ہونا چاہیے اور اس پر ہر ایک کا حق یکساں ہونا چاہیے ۔

ہاں سردست معاشرۂ انسانی اس منزل پر نہیں جہاں وہ ''میرے تیرے'' کے فرق کو ختم کر کے ملکیت کے تصور سے دست بردار ہو جائے لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اسلام اسی منزل پر کاروانِ انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے ۔

اور زیادہ وضاحت کے لیے یوں سمجھیے کہ قرآن نے انسان کی ان فطری کمزوریوں کی رعایت سے بھی کچھ ہدایات دی ہیں اور جہاں اس

قافلۂ انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے اس کے لیے بھی ہدایات دی ہیں اور صرف ہدایات ہی نہیں بلکہ اور ایک بڑا احسان یہ کیا ہے کہ اس منزل پر پہنچے ہوئے راہرو کا ایک عملی نمونہ محمد رسول اللہؐ کی شکل میں بھیج دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو دیکھیے کہ:

> ہم نہ وارث ہوں نہ موروث، ہمارا ترکہ کار خیر (قوم کی مشترکہ ملکیت) ہے۔

اس فرمان سے ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی ایک ہی نتیجہ نکال سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں انفرادی ملکیت کا سراغ ملتا ہے وہ ایسے احکام ہیں جو نسبتاً عام درجے کے انسانوں کے لیے ہیں اور اس راہ سے جس منزل پر لے جانا مقصود ہے وہ وہی مقام ہے جس پر رسولؐ خود ایک مجسم نمونہ بن کر کھڑا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

ملکیت کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ کچھ چیزیں فرد کے استعمال کے لیے اس کے تصرف میں دی جاتی ہیں جن کا وہ صرف امین ہوتا ہے، مالک وہ ان کا بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ کرتی ہے:

> بندہ "میرا مال میرا مال" بکتا رہتا ہے حالانکہ مال میں اس کے حصے کی صرف تین چیزیں ہوتی ہے (۱) جو وہ کھا کر ہضم کر لے (۲) پہن کر پرانا کر دے (۳) اور کسی کو دے کر اپنا ذخیرۂ آخرت بنا لے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ چلا جاتا ہے یا دوسروں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

(رواہ مسلم عن ابو ہریرہؓ)

گویا خوراک اور پوشاک یعنی معمولی ضروریات زندگی کے علاوہ جو چیز بھی انسان کے تصرف میں ہوگی اس کی شکل یہ ہوگی کہ:

> یا تو وہ کسی کارخیر میں دے دے۔ (اعطی فاقتنی)
> یا وہ ذاہب ہو یعنی کسی طرح اپنے قبضے سے نکل کر چلا جائے۔ (فھو ذاھب)

یا وہ پس ماندوں کے لیے چھوڑ جائے۔ (او تارکہ للناس)

یہ پہلی صورت وہ ہے جسے قرآن ''انفاق عفو'' کہتا ہے یعنی جو ضروریات زندگی سے فاضل ہو وہ کسی کارخیر میں اپنی خوش دلی سے دے دے ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ معاشرے کے حوالے ہو جائے۔ نہیں تو تیسری شکل یہ ہے کہ ورثا کے لیے چھوڑ جائے۔ گویا انسان کا اصلی حق صرف ضروریاتِ زندگی ہے؛ اس پر بھی دراصل ملکیت کوئی نہیں صرف اختیار تصرف بطور امین ہے۔ باقی کارخیر کے لیے (ماترکنا صدقتہ) جو سواء للسائلین یعنی تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں ہے۔

ان تشریحات کے بعد جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس کے پاس بھی زائد از ضرورت زمین اس طور پر ہے کہ دوسرے اس سے یکسر محروم رہیں وہاں معاشرے کا یہ فرض ہے کہ اسے دوسرے محروموں کے لیے واپس لے لے۔ اصل غرض تو یہی ہے کہ وہ خود خوش دلی کے ساتھ دے دے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو معاشرے کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جتنی زیادہ خوش دلی باقی رکھی جا سکتی ہو اسے باقی رکھتے ہوئے اس سے واپس لے لے۔

زمین کی مشترکہ ملکیت ہی کی طرف ایک حدیث میں بھی یوں اشارہ ہے:

> عروہ کہتے ہیں کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ زمین خدا کی زمین ہے اور بندے اسی کے بندے ہیں۔ (طبرانی عن عروہ)

ہم تو صرف زمین کے متعلق بحث کر رہے ہیں، احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ پیسہ بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

> اشرفی یا روپیہ اس زمین پر اللہ کی مہریں ہیں۔ جو اپنے مولا کی مہر دکھاتا ہے اس کی ضرورت پوری کر دی جاتی ہے۔
>
> (اوسط بضعف عن ابی ہریرہ)

بس صرف زمین ہی نہیں بلکہ رزق کے تمام سرچشمے قوم کی مشترکہ دولت ہیں۔ ذاتی ملکیت کا تصور صرف ایک ذہنی تحریک ہے، کسب دولت کے لیے اور اسلام اس سے صرف اتنا ہی کام لینا چاہتا ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے انتہائی حکیمانہ تدریج مطلوب ہے ورنہ ایک طرف مفت خوروں کی

تعداد بڑھتی جائے گی اور دوسری جانب خود کاسب کی تحریکِ کسب کم سے کمتر ہوتی جائے گی۔

ان تمام گفتگوؤں کا خلاصہ یہ ہے کہ ذاتی ملکیت اسلام کی کوئی قدر مستقل نہیں لیکن اس سے کسبِ دولت کے جذبے کا کام اس انداز سے لیا جانا چاہیے کہ رفتہ رفتہ تصور ملکیت کم ہوتا جائے اور کسبِ دولت کا محرک صرف اخلاق جذبہ رہ جائے۔

نیز ملکیت و عدم ملکیت کا قیام یا اختتام حالات زمانہ اور اس کے تقاضوں پر موقوف ہے۔ جب جس پہلو میں خیر غالب ہو وہی باقی رکھا جائے گا۔ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ قرآن جس چیز کے متعلق خاموش ہو (اور خصوصاً جبکہ روایات بھی متناقض ہوں) تو وہی شے باقی رکھی جائے گی جو ''انفع للناس'' ہو۔ اگر کہیں لامحدود زمین کی ملکیت اس طرح چلی آ رہی ہے کہ وہ انفع للناس ہے یا کم از کم اتنا ہی ہو کہ وہ مضرللناس نہ ہو تو اسے باقی رکھا جا سکتا ہے لیکن جب وہ مضرللناس ہو — اور آج کل تو اضرللناس ہے — تو اسے کتاب و حکمت باقی رکھنے کی روادار نہیں ہو سکتی نہ فقہ و سنت روادار ہے۔

حضور اکرم صلعم نے خیبر کی زمین مجاہدوں میں تقسیم فرمائی تھی۔ اس بنا پر بہت سے صحابہ کرام رض نے دور فاروقی میں مفتوحہ ممالک کی تقسیم کا مطالبہ کیا لیکن ایک طویل رد و قدح کے بعد سیدنا فاروق اعظم رض نے یہی فیصلہ دیا کہ ایک انچ زمین بھی نہیں تقسیم ہوگی۔ پس جب تقسیم زمین کا مسئلہ مختلف دور میں بدل سکتا ہے تو ملکیت زمین کون سا ایسا مسئلہ ہے جس کی شکل بالکل بدلے ہوئے حالات میں بھی نہ بدل سکے؟ آج کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ارباب حل و عقد زیادہ بہتر رائے دے سکتے ہیں۔ ہم اس وقت اپنی دیانت دارانہ رائے یہی رکھتے ہیں کہ اس وقت زمین کو — بلکہ دوسرے سرچشمہائے رزق کو بھی — بلا تحدید وسعتوں کے ساتھ باقی رکھنا قوم و ملک اور انسانیت کے لیے سم قاتل ہے۔

* * *

فقیر بخش بگٹی

اسلام کا معاشی نظام

کلمۂ توحید یوں تو ایک مختصر سا جملہ ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ہر اُس نظام سے اعلانِ جنگ ہے جس میں نوعِ انسان کی وحدت کی نفی ہو ، انفرادی مفادات کا تصادم ہو ، انسان کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں عدمِ مساوات ہو اور افرادِ معاشرہ میں سے کوئی تو حیلے بہانے سے حاکم بن بیٹھے اور دیگر لوگ اس کے محکوم ہو کر حکام کے تابعِ مرضی ہو کر رہ جائیں ۔ لاالٰہ سے مراد یہ ہے کہ نوعِ انسان میں کسی فرد کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی حاکیمت کا دعویٰ کرے یا ایسے لوگوں کے کسی گروہ کا بنایا ہؤا قانون ، دوسروں کے لیے ، ضابطۂ حیات کی حیثیت حاصل کرے ۔ الااللہ سے مطلب یہ ہے کہ سزاوارِ حکمرانی ایک وہی ذات بسیط و اعلیٰ ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ، جو انسان کا خالق اور رب ہے ، جو سب سے الگ ہونے کے باعث سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی پسند کا معیار ، اُس کی حاکمیت کا اقبال بالعمل یا اس کے دیے ہوئے قانون کا کُلّی اتباع ہے ۔ اور محمد رسول اللہ کا یہ مفہوم ہے کہ خدا کی حاکمیت کا واحد قانون وہ ہے جو آپؐ کی وساطت سے ملا ؛ اِس قانون سے باہر نہ تو نوعِ انسان میں وحدت ممکن ہے ، نہ اُن کے مفادات میں ہم آہنگی کا کوئی امکان ہے اور نہ امنِ عالم قائم ہو سکتا ہے !

محمدؐ کو خدا کی طرف سے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود ، وحدت و یکجہتی ، نوعی مساوات ، امن و آشتی اور مبرہ از فساد ترقی و خوشحالی کے لیے جو قانون دیا گیا وہ قرآنِ حکیم ہے ۔ قرآن کا دعویٰ یا اس کی دعوت مختصراً یہ ہے کہ خدا کائنات اور نوعِ انسان کا خالق اور رب ہے ، جس طرح ساری کائنات فطری قوانین کے تحت مشیتِ ایزدی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور ان قوانین کی بے چون چرا اطاعت کے باعث فساد سے مامون اور امن سے معمور ہو کر اپنی ارتقائی منازل بخیر و خوبی طے کر

رہی ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی امن کا واحد ضابطہ وہی ہے جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ پھر، قرآن، انسان کی زندگی کے دو حصے کرتا ہے۔ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے اُس میں انسان بھی کائنات کی طرح اُن قوانین کی اطاعت کے لیے مجبور ہے جو اس کی طبیعت یا فطرت میں مستتر ہیں، مثلاً اس کا سانس لینا، کھانا پینا، پیدا ہونا اور بالآخر مرنا وغیرہ۔ انسانی زندگی کا دوسرا حصہ اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی ہے۔ اس میں اس کو صاحبِ اختیار بنایا گیا، یہی اس کی وہ زندگی ہے جسے اس نے اپنی مرضی سے بسر کرنا ہے۔ قرآن اس زندگی سے متعلق اس کو وہ بنیادی اصول دیتا ہے جن کے ماننے سے اس کی معاشی اور معاشرتی دنیا بھی عین اُس طرح امن در آغوش، مبّرہ از فساد اور جنت بداماں ہوگی جس طرح کائنات اور خود اس کی طبعی زندگی میں ہر قسم کے فساد کا فقدان ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کے اتباع کا نتیجہ امن اور اس سے انحراف کا انجام فساد اور بالآخر تباہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا نقطۂ ماسکہ عمل اور مکافاتِ عمل ہے۔

علاوہ ازیں، قرآن کی رو سے، یہ کرۂ ارض انسان کے لیے ہے۔ انسان کی پیدائش اسی سے ہوئی، اس کی زندگی کے قیام کا سامان اسی سے ہے اور یہ اُس کے لیے متاعِ مفت ہے۔ چونکہ یہ متاعِ مفت ہے اور خدا کی پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے اس لیے تمام انسان اپنی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کے لیے اس پر مساوی استحقاق رکھتے ہیں۔ پھر چونکہ رزق، مال اور دولت کا سرچشمہ زمین ہے اس لیے نہ تو اس پر کسی کو ناجائز تصرف کا حق حاصل ہے اور نہ ہی اُس کے سامانِ زیست یا مال و دولت کو اپنے طور پر سمیٹ کر رکھنے اور دوسروں کی ضروریات کو روکنے یا اُن کو گھٹانے کا کسی کو اختیار ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کی رو سے انسان اور کائنات (بمع زمین) خدا کی مخلوق ہیں، زمین اور تمام کائنات پر جملہ افراد انسانیہ کو مساوی حق اور دسترس حاصل ہے اور اس مساوات وعدل کا حصول صرف اور صرف اُس ضابطۂ حیات کے اتباع سے ممکن ہے جو انسان کو قرآن کی شکل میں آخری بار اور تا آخر من جانب اللہ ملا ہے۔ چونکہ معاشرت، سیاست اور دیگر شعبہ ہائے حیات اساسی طور پر معیشت سے وابستہ ہیں اس لیے اس مختصر سی تمہید کے بعد میں قرآن کے دیے ہوئے معاشی نظام کو مجملاً پیش کرنے کی کوشش کروں گا

تاکہ قارئینِ کرام اندازہ فرما سکیں کہ قرآنی معاشی نظام، اپنی منزہ صورت میں ، موجودہ دیگر نظاموں سے کس قدر ارفع و اعلیٰ اور انسان کی اپنی داعیاتِ حیات یا فطرت سے کس قدر ہم آہنگ ہے !

انسان کی محوری حیثیت

قرآن کی رُو سے انسان اس ارض پر من حیث النوع متصرف ہے اور اس تصرف میں کسی بھی فرد کو دوسرے افرادِ نوع پر نہ تو کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ امتیاز۔

> اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (۲ : ۳۰)

اس آیت سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ انسان کی محوری حیثیت خلافت فی الارض ہے۔ یہ فریضہ یا عطیہ سب انسانوں کو مساوی طور پر حاصل ہے ؛ خلافت انسان کی ہے اور یہ زمین نوعِ انسان کے لیے ہے۔ نہ صرف زمین ، بلکہ زمین کے ساتھ ساتھ یہاں کی ساری مخلوق اور کائناتی قوتیں انسان کے تابعِ فرمان اور اسی کے لیے ہیں۔

> اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو (انسان کے تابع ہو جاؤ) تو سب نے ، ماسوائے ابلیس ، سجدہ کیا۔ اُس نے اپنی بزرگی اور بڑائی کی شیخی بگھار کر انکار کیا۔ (۲ : ۳۴)

یہاں تک ہم دیکھ چکے کہ زمین اور زمین پر موجود ساری مخلوق انسان کے تابع ہیں اور انسان کے لیے ہیں۔ یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ نوعِ انسان کے لیے ہے ، ہر چیز پر اس نوع کا تصرف ہے اور اس تصرف و استفادہ میں جملہ افرادِ انسانیہ برابر کے شریک و مستحق ہیں۔ لیکن ، اس کے ساتھ ساتھ ، انسان میں ایک قوت ایسی بھی ہے جو اس میں ایسا بے بنیاد اور نظر فریب جذبہ پیدا کرتی ہے جس سے مغلوب ہو کر اس میں بڑائی ، ایک دوسرے پر فوقیت اور ایک دوسرے کے مساوی حقوق سے انکار کی گرہ پڑ جاتی ہے (اَبٰی وَاستَکبَرَ) اور جس سے اس کی پُر امن زندگی ظلم و زیادتی اور نفاق و زوال کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

> اور ہم نے آدم سے کہا کہ تو اور تیری زوجہ الجنت میں رہو اور حسب منشا اس سے کھاؤ پیو مگر دیکھنا اس شجر کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے - مگر اُن دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا - اس پر وہ دونوں اس میں سے خارج کیے گئے - ہم نے کہا (اے بنی آدم) تم باہمی دشمنی کی سطح پر اتر جاؤ اور یہ زمین ایک مقررہ وقت تک تمہارے واسطے جائے سکونت و سامانِ زیست ہے - (۲ : ۳۵-۳۶)

اِس وقت ابلیس یا شیطان کی ماہیئت و حقیقت سے بحث کی گنجائش نہیں ہے مگر ان آیات سے اتنا تو بالصراحت ثابت ہے کہ ابلیسیت اور شیطنت سے مراد بڑائی اور بزرگی کا وہ جذبہ ہے جس کے تحت نوعِ انسان کی وحدت ، تحصیلِ مال کی حرص کے باعث ، پارہ پارہ ہوتی ہے - آیت نمبر ۲:۳۵ میں ''شجر'' کا لفظ خاص طور پر اس مطلب کی توثیق کرتا ہے کیونکہ شجر ، چاہے وہ کیسا اور کونسا ہو ، یقیناً کسی نہ کسی طرح انسانی استعمال کی شے ہونے کی جہت سے ایسی شخصی ملکیت اور باہمی مسابقت کا غماز ہے جس کے باعث اس نوع میں نفاق ، عدویت یا دشمنی پیدا ہوئی - اس سے ظاہر ہے کہ نوع انسان میں نفاق و عدویت کی بنا ، بنیادی طور پر ، مال و رزق اور اس کا ایسا ارتکاز ہے جس سے متاثر ہو کر محرومین اپنے غاصبین سے برسر پیکار ہوتے ہیں - اس کے برعکس ، الجنت اُس معاشرے کا نام ہے جس میں نہ انفرادی یا قومی مفادات کا تصادم ہو، نہ اختلاف و افتراق ہو اور نہ سلب و نہبِ مال ہو بلکہ افرادِ معاشرہ باہم ایسی الفت بھری اور پر لطف زندگی گذاریں جیسی کہ اچھے زوجین کی ہوتی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ قرآن اس الجنت کے حصول کا کیا طریق بتلاتا ہے اور اس سے کیا مراد لیتا ہے ؟ چونکہ انسانی زندگی کی ہر شے بنیادی طور پر زمین سے وابستہ ہے اس لیے پہلے دیکھیے کہ زمین اور اس کی متاع کے بارے میں قرآن کا کیا عندیہ ہے ؟

زمین اور اس کی متاع سب انسانوں کے لیے ھے

آیت نمبر ۲:۳۶ میں زمین کو نوعِ انسان کی مشترکہ جائے سکونت (مستقر) اور متاعِ حیات قرار دیا گیا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کے

نزدیک زمین اور اس کے سامانِ زیست کا صحیح مصرف صرف یہی دو مدات ہیں اور ان میں جملہ انسان برابر کے شریک اور مساوی استحقاق رکھتے ہیں ۔ ایک دوسری جگہ وَ جعلنا لکم فیھا معایش (۱۰:۷) کہا گیا ہے ۔ ہم نے زمین میں تمھارے واسطے سامانِ معاش رکھا۔ اس میں بھی زمین کے سامان معیشت کو تمام نوع انسان کا قرار دیا گیا ، زمین سے جس قدر فوائد ہوں وہ سب کے لیے ہیں۔ والارض وضعھا للانام (۵۵:۱۰) ” زمین کو انام کے فائدے کے لیے بنایا گیا “ نہ صرف یہ ، بلکہ زمین ، انام اور انعام کے لیے متاع حیات ہے : متاعاً لکم ولانعامکم (۸۰ : ۲۲) ” زمین تمھارے اور تمھارے مال مویشی کے لیے سامانِ زیست ہے ۔ “ پھر ، واضح الفاظ میں ضرورت مندوں کو اس پر یکساں استحقاق دے کر کہا گیا کہ ہر فرد حسب ضرورت اس سے اپنی زیست کا سامان حاصل کرے : سواءً للسائلین (۱۰ : ۴۱)

ان سب آیات میں ” لَکُمْ “ کا لفظ آیا جس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس کا سامانِ حیات سب کا ہے اور اس کے حصول کا اصول ”سَوَاءً “ ہے یعنی اس سے استفادے کا حق سب کو مساوی طور پر حاصل ہے ۔ قرآن نے زمین کو انسان کے لیے جائے سکونت اور متاعِ حیات قرار دیا ۔ اس سے زیادہ یا اس سے باہر اور کوئی بھی مصرف قرآن نے نہیں بتلایا ۔ دنیا میں استعمال کی ہر شے بنیادی طور پر زمین سے پیدا ہوتی ہے ۔ جب زمین پر اپنی ضرورت سے زیادہ کوئی بھی شخص تصرف نہیں رکھ سکتا تو اس کی پیداوار کا اس طور پر ارتکاز کہ اس سے سرمایہ داری وجود کوش ہو بجائے خود ممنوع ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مطابق زمین ، نوعِ انسان کے لیے مشترکہ متاع زیست ہے ، اس میں سب انسان برابر کے شریک ہیں ، کسی کو نہ تو کسی پر کوئی تخصیص حاصل ہے اور نہ ہی اس مساوی اشتراک کو اپنے طور پر کسی کو توڑنے کا اختیار ہے !

بیع ، شریٰ اور تجارت

انسانی زندگی میں زمین کے بعد دوسرا شعبہ بیع و شریٰ ہے جس کا تعلق مال سے ہے حالانکہ اساسی طور پر یہ بھی زمین ہی کی پیداوار سے منسلک ہے ۔ قرآن حکیم میں بیع اور شریٰ دونوں اصطلاحات آئی ہیں ۔ ان

دونوں کے بنیادی معنی خریدنا اور فروخت کرنا ہیں ۔ یعنی ان میں سے ہر لفظ خریدنے کے لیے بھی آتا ہے اور فروخت کرنے کے لیے بھی۔ تجارت بھی خرید و فروخت کو کہتے ہیں ۔ تجارت اور بیع کے بارے میں ارشاد ہے :

وہ لوگ جن کو تجارت اور بیع قانونِ الٰہی (قرآن) سے منحرف نہیں کرتے (۳۷ : ۲۴)

گویا بیع ہو کہ تجارت ، یہ کاروبار قرآن کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق ہوگا اور اس جہت میں قرآن کا رہنما اصول لیس للانسان الاماسعی (۵۳:۳۹) ہے یعنی ہر انسان صرف اپنی محنت کے معاوضے کا حقدار ہے۔ بیع اور تجارت چونکہ ایک ہی آیت میں جدا جدا آئے ہیں اس لیے ''بیع'' تو اپنے بنیادی معانی کی رُو سے اشیاء کا اشیاء سے تبادلہ (Barter) ہے اور تجارت سے سوداگری (Trade) مراد ہے ۔ ہر شے میں دو قدریں ہوتی ہیں ، ایک انسانی محنت اور دوسرا سرمایہ ۔ سرمایے پر منافع لینا قرآن کی رو سے ممنوع ہے ۔ قرآن صرف انسان کی محنت کے معروف معاوضے کو جائز قرار دیتا ہے ۔ ظاہر ہے یہ معروف معاوضہ اجتماعی نظام ہی مقرر کرتا ہے اور یہ اتنا ہی ہوتا ہے جو محنت کرنے والے شخص اور اس کے لواحقین کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو ۔ اس سے نہ تو قدرِ زائد پیدا ہوسکتی ہے اور نہ سرمایہ داری ممکن ہے ! یہی صورت شرعی کی ہے !! اس کی حقیقت کی مزید وضاحت مندرجۂ ذیل آیات سے ہوتی ہے :

(۱) تباہی ہے کمی کرنے والوں پر ، جو دوسروں سے تو پورا پورا ماپ تول کر لیتے ہیں مگر دوسروں کو دیتے وقت ماپ تول میں کمی کرتے ہیں (۱۳ : ۸۳) ۔

اس آیۂ جلیلہ میں ایک بہت بڑی کاروباری حقیقت بیان کی گئی ہے ۔ اِس میں اُس ذہنیت کی نشاندہی کی گئی جس کے تحت اپنی محنت کے علاوہ سرمایے پر منافع خوری کی جاتی ہے کیونکہ کسی شے کو فروخت کرتے وقت اُس میں کمی کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنی قدرِ خرید (سرمایہ) کو فروخت کرتے وقت بڑھایا جائے ۔ یہ وہی کچھ ہے جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں قدرِ زائد کہا جاتا ہے جو قرآن کی رو سے ممنوع ہے کیونکہ اس جہت میں قرآن کا معروف اور معیاری اصول لا تظلِمون ولا تُظلمون (۲:۲۷۹) ہے ۔ یعنی ''نہ تم کسی سے کمی وبیشی کرو اور نہ تم سے کوئی

کمی و بیشی کرے ۔ " اب دوسری آیت دیکھیے :

(۲) ایک دوسرے کا مال باطل طور پر مت کھاؤ ہاں مگر باہمی رضامندی سے تجارت کر سکتے ہو (۴:۲۹)

یہاں دیکھیے کہ تجارت کے سوا کسی کے مال کو لینے یا کھانے کی صاف ممانعت ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کی کمائی کو کسی بھی نام اور بہانے سے لینے یا چھیننے کی اجازت نہیں ہے ۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ قرآنی نظام حیات میں نہ کوئی آجر ہوگا نہ مزدور ، نہ زمیندار ہوگا نہ مزارع ، نہ آقا ہوگا نہ غلام اور اس لیے نہ امیر ہوگا نہ محتاج ۔ پھر یہاں اُس تجارت کی تعریف کی گئی ہے جسے قرآن جائز قرار دیتا ہے ۔ قرآن کے نزدیک تجارت میں " تَراضٍ مِنْکُم " ضروری ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تجارت یا اشیاء کے خرید و فروخت میں بائع و مشتری کی باہمی رضامندی ضروری ہے ۔ ظاہر ہے کوئی بھی مشتری اپنی مرضی سے کسی بھی شے کو اتنی قیمت پر خریدنے کے لیے تیار نہ ہوگا جس کے نتیجے میں کوئی سوداگر یا دوکاندار اپنے سرمایے پر منافع لگاتے لگاتے سرمایہ دار بن جائے اور خریدار محتاج و مفلس ہو کر رہ جائے ۔ اس سے غیر مشتبہ حد تک ثابت ہو گیا کہ بیع و شریٰ اور تجارت بھی قرآن کے نزدیک انسانی ضروریات زندگی کے حصول کا ایک وسیلہ ہیں اور اس شعبے میں بھی قرآن ، انسانی مساواتِ زندگی اور سامانِ زیست کی تحصیل میں ، کسی بھی قسم کے فرق و تمیز کا روادار نہیں ہے !

ربٰو

تجارت وغیرہ کے علاوہ لین دین کی ایک اور شکل بھی ہے جس میں صرف سرمایہ باعثِ منافع ہوتا ہے ۔ اس کو ربٰو یا سود کہا جاتا ہے ۔ لین دین کی یہ شکل عہدِ قدیم میں بھی مروج رہی اور آج کل بھی، اشتراکی ممالک کو چھوڑ کر ، دنیا کے دیگر تمام معاشروں میں رائج ہے ۔ اس لیے جب قرآن حکیم کا نزول ہؤا تو اُس نے اس کی قطعی حرمت کا اعلان کر دیا ۔ رَبَا ، یَربُو کے معنٰی ہیں زیادہ ہونا ، بڑھنا ، پھولنا وغیرہ ۔ ان معانی سے ظاہر ہے کہ یہ بڑھوتری ہر زیادتی پر محیط ہے ۔ اس میں روپیہ دے کر " اصل " سے کچھ زیادہ لینا اس کی صرف ایک شکل ہے ۔ دراصل ، یہ ہر اُس لین دین یا آمدنی پر حاوی ہے جو اپنی محنت کا معاوضہ

نہ ہو ؛ چاہے یہ مزارعت سے آئے یا راس المال سے ، اس کے بارے میں قرآن حکیم کا واضح حکم یہ ہے :

اللہ نے بیع کو حلال ٹھیرایا ہے اور ربٰو کو حرام - (۲ : ۲۷۵)

یہاں ربٰو کو بیع کی ضد قرار دیا گیا - ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے " بیع " لین دین کے اُس طریق کا نام ہے جس میں سرمایہ لگا کر صرف محنت کا معاوضہ لیا جاتا ہے ، سرمایے پر کوئی منافع نہیں لیا جاتا - پھر بیع ہر قسم کے لین دین کو کہتے ہیں ، اس میں تجارت و سوداگری یا اشیاء کا تبادلہ ، کی سب شکلیں آتی ہیں - اب ربٰو جب بیع کی ضد ٹھہرا تو اس سے ایک تو یہ ثابت ہے کہ اس میں سرمایے پر منافع لیا جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ یہ ہر اُس آمدنی پر محیط ہے جو محنت کے بغیر حاصل ہو—یہ صرف روپے پر ، بغیر محنت کے ، منافع لینا نہیں ہوتا ! دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ بیع کا منافع یا معاوضہ ، محنت کی اُجرت ہے اور ربٰو کا منافع ، اس کے برعکس ، سرمایے پر ہوتا ہے جو حرام و ممنوع ہے - چونکہ سرمایے پر بڑھوتری حرام ہے اس لیے اس کا بھی واحد مطلب اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی معاشرے میں ذاتی سرمایے کا پھولنا یا پھیلنا ، چاہے وہ کسی شکل اور کسی نام سے کیوں نہ ہو ، ممنوع ہے - ویسے بھی قرآن جب تجارت میں بھی سرمایہ داری کے مخالف ہے تو وہ ربٰو کو کیونکر جائز قرار دے گا ؟

یہاں ایک اور اہم نکتے کی وضاحت بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ملک میں بعض مفکرین کے نزدیک سود در سود تو ممنوع ہے اور سادہ سود جائز ! یہ اندازِ فکر بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ ایسے حضرات قرآن کے اس بنیادی اور محوری اصول سے نابلد ہیں کہ قرآن حکیم ، نوع انسان سے ، ہر قسم کی معاشی اور معاشرتی تفریق و اختلاف کو مٹانا چاہتا ہے - چنانچہ وہ سود کے جواز میں اس آیت کو غلط معنی دے کر ، پیش کرتے ہیں :

بڑھا بڑھا کر (یعنی سود در سود) مت کھاؤ (۳:۱۲۹)

اس آیت کے یہ وہ مروجہ معانی ہیں جن سے غلط اور گمراہ کن استنباط کیا جا رہا ہے اور جو میں نے بھی اس لیے کیے ہیں کہ ان کو بیان کرکے اس آیت کے حقیقی معانی بتلائے جائیں - عربی میں "ضَعف" رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور "ضُعف" بدن کی نقاہت کو - اس کے

برعکس ، ضِعف" کے معنی ہیں کسی شے کا مثل ، برابر کا حصہ ، اتنا ہی اور—اور اس اعتبار سے دوگنا ہونا بلکہ تگنا اور چوگنا ہونا وغیرہ ۔ مندرجۂ بالا آیت میں اَضعافاً مُضٰعفَۃً" کے الفاظ ضِعف" سے نہیں ہیں بلکہ "ضُعف" سے ہیں جس کے معنی بڑھنے یا زیادہ ہونے کے نہیں ہیں بلکہ کم یا کمزور ہونے کے ہیں ۔ لہذا ، اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ تم اپنے خیال (رائے) کے مطابق یہ سمجھتے ہو کہ سودی کاروبار سے تمھارا سرمایہ بڑھتا یا زیادہ ہوتا ہے مگر یہ خیال غلط ہے ، درحقیقت سود ملکی سرمائے کو گھٹاتا اور افرادِ معاشرہ کی مالی بدحالی و معاشی کمزوری کا باعث ہے ۔ قرآن حکیم نے تو ہر قسم کے ربٰو کو خدا اور اس کے رسول ؐ سے جنگ قرار دیا ہے :

> اے اہل ایمان ! قانون الٰہی کو مان کر اپنے سود کا بقایا چھوڑ دو اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو سمجھ لو کہ یہ خدا اور اس کے رسول سے جنگ کے مترادف ہے ۔ (۲:۲۷۸،۲۷۹)

غور کیجیے کہ قرآن کی نظر میں سود کس قدر مکروہ ہے اور یہ انسانی زندگی کے لیے کس قدر مضر ہے !

قرآن کا یہ اعلان از بس معنی خیز اور اس کے بنیادی مقصد وحدتِ انسانیت اور اخوتِ مومنین سے ہم آہنگ ہے ۔ سود کیوں لیا جاتا ہے ؟ اس لیے کہ سود لینے والے کے دل میں معاشرے کے دیگر افراد سے علیٰحدگی و غیریت کا جذبہ ہوتا ہے ۔ وہ دوسروں سے اپنے راس المال سے زیادہ اس لیے وصول کرتا ہے کہ وہ ، اُن کو غیر تصور کرتا ہے اور اپنے آپ کو اُن سے علیٰحدہ ! یہ تصور چونکہ نوعِ انسان کی وحدت کی نفی اور مومنین کی اخوت و مساوات کا ابطال کرتا ہے اس لیے وہ قرآن کے دیے ہوئے نظریے سے نہ صرف متصادم ہے بلکہ اس کے متناقض ہے ۔

یہاں تک ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن ، زمین اور اس کی متاعِ حیات کو نوعِ انسان کی مشترکہ ملکیت قرار دیتا ہے اور اُس سے استفادے کا اصول یہ ہے کہ اس سے ہر شخص اپنی ایسی حاجت کے مطابق جو پر امن قیامِ حیات کی ضامن ہو ، لے سکتا ہے ۔ قرآن کے نزدیک صرف اتنی زمین پر تصرف جائز ہے جو ایک کنبے کی ضروریاتِ زندگی کی اوسط کفالت کے لیے کافی ہو اور جسے کارکن فردِ کنبہ خود کاشت کرے ۔ قرآن تجارت میں

اس قدر منافع کو صحیح مانتا ہے جو فرد کے سب لواحقین کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کرے ۔ اور قرآن سود کو حرام قرار دیتا ہے ۔ ان سب باتوں سے واضح ہے کہ قرآن ایسی ہر ملکیت کی نفی کرتا ہے جو بڑھتے بڑھتے سرمایہ داری پر منتج ہو ! اس جہت میں قرآن کا رہنما اصول لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ہے : ہر شخص صرف اپنی محنت کے ماحصل کا مستحق ہے ، کوئی بھی انسان کسی دوسرے کی محنت کو نہ خرید سکتا ہے ، نہ اس کی کمائی میں شریکِ بیکار ہو سکتا ہے اور نہ اُس کے راستے کی دیوار بن سکتا ہے !

نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قبل ازیں قرآن نے جن حقائق کو بیان کیا گیا وہ ایک نظام کے مقتضی ہیں ۔ ان کو جب تک ایک باقاعدہ نظام سے منسلک نہ کیا جائے اُس وقت تک وہ مجردات تو ہوں گے مگر انسانی زندگی کے عملی مسائل میں ممد نہیں ہو سکتے ۔ اس لیے قرآن نے اس مقصد کے حصول کے لیے نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ پیش کیا :

صلوٰۃ

صلوٰۃ ، صَلَو سے ہے ۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ صلی سے ہے ۔ صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِیَۃً اُس وقت کہا جاتا ہے جب گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر کا گھوڑا ، پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طور پر دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کے کان پہلے کی سرین سے مل رہے ہوں ۔ آگے جانے والے گھوڑے کو سابق کہتے ہیں اور دوسرے نمبر کے گھوڑے کو اَلْمُصَلّی اس سے ظاہر ہے کہ صَلّی کے معنی ہیں اگلے کے ساتھ ملے ہوئے، اُس کے پیچھے پیچھے آنا ۔ ان معانی سے عیاں ہے کہ صلوٰۃ کے معنی ہیں پیچھے پیچھے چلنا، اتباع کرنا وغیرہ۔ اتباع و اطاعت چونکہ کسی ذات کی ہوتی ہے اور وہ ذات ، متبعین سے، ارفع ہونی چاہیے اس لیے صلوٰۃ میں مُطاع، خدا ہے جو ارفع ، اعلیٰ ، اور بے نظیر و یکتا اور مکمل ترین ذات ہونے کی جہت سے اس لائق ہے کہ اس کو انسانی ذات کی تکمیل کے لیے منزل بنایا جائے۔ پھر چونکہ خدا کو انسان کی مادی آنکھ دیکھنے سے معذور و عاجز ہے اس لیے عملی میدان میں مطاع کی حیثیت اُس کے اُس دیے ہوئے ضابطۂ حیات کو حاصل ہے جو قرآن میں ہے اور جو نہ صرف ضابطۂ حیات ہے

بلکہ اُس میں خدا کے وہ تمام اوصاف بھی محدود ہیں جن کو ' بحدِ بشریت ' انسان نے ، اپنی تکمیل کے لیے ، اپنے آپ میں منعکس کرنا ہے ۔ ان اوصاف کے حصول کا طریقہ اور مثالی عملی زندگی کا نقشہ صلٰوۃِ باجماعت میں پیش کیا گیا جس میں فقیدالمثال مساوات ، بے نظیر اتحاد ، اور منفرد صدقدلانہ اطاعت کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ امام، جماعت سے قدرے آگے، ہوتا ہے اور اس کی ہر حرکت کا اتباع بطیب خاطر کیا جاتا ہے ۔ یہ صلٰوۃ کے بنیادی معانی کی عملی تشریح ہے ۔ پھر امام اس رسی کو کہتے ہیں جس سے معمار دیوار کو برابر کرتا اور اس کی اونچ نیچ دور کرتا ہے ۔ گویا صلٰوۃ کا امام بھی مومنین میں عملی اخوت و مساوات سکھانے اور اُسے معاشرے میں نافذ کرنے پر مکلف ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صلٰوۃ وہ ضابطۂ حیات ہے جس کے مطابق مومنین (قرآن کو ماننے والے) اپنی زندگی گذارتے ہیں ۔ ان معانی میں صلٰوۃ کا ذکر جا بجا قرآن میں آیا ہے :

> کیا تو نہیں دیکھتا کہ ارض و سماوات میں جو کچھ بھی ہے وہ ، اور پر پھیلائے ہوئے پرند ، سب کے سب ، خدا کی تسبیح کرتے ہیں ۔ ہر ایک اپنی اپنی صلٰوۃ اور تسبیح کو جانتا ہے ۔ (۲۴:۴۱)

ظاہر ہے کہ کائنات کی متنوع مخلوقات ایسی صلٰوۃ نہیں پڑھتیں جو ہمارے ہاں نماز کے معنوں میں مروج ہے۔ بلکہ یہاں صلٰوۃ سے مراد ان میں سے ہر ایک کا وہ طریق زندگی ہے جو مشیت ایزدی نے اس کی جبّلت میں سمو دیا ، اور تسبیح ، وظائف حیات کی تحصیل و تکمیل کی وہ بھرپور مساعی ہیں جو اُس ضابطۂ زندگی کے تحت کی جاتی ہیں ۔ گویا صلٰوۃ سے مراد ضابطۂ حیات ہے ۔

> وہ صلٰوۃ قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں (۴۲:۳۸)

یہاں صلٰوۃ کی تشریح باہمی مشاورت نے کی ۔ اس سے معلوم ہوُا کہ صلٰوۃ ، اُس نظام حیات کا نام ہے جو نوع انسان کو خدا کی طرف سے ملا اور جس کے مطابق امور زندگی ، اُس کے بنیادی اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے ، باہمی مشاورت سے طے کیے جاتے ہیں ۔ یہاں باہمی مشاورت (شُورٰى بَيْنَهُم) قابل غور ہے ۔ اول تو اس سے یہ ثابت

ہے کہ اسلامی نظام میں حاکم و محکوم کا کوئی تصور نہیں ہے اور تمام افراد معاشرہ کی حیثیت یکساں ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ جہاں معاملاتِ زندگی (اور معاملات بنیادی طور پر معاشی و معاشرتی ہی ہوتے ہیں) باہمی مشاورت سے طے کیے جائیں وہاں نہ کسی کے امیر بننے کی گنجائش ہو سکتی ہے اور نہ کسی کے مفلس ہونے کی، نہ کوئی سرمایہ دار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مزدور۔

زکٰوۃ

اقامت صلٰوۃ کا مدعا ہے ایتائے زکٰوۃ۔ زکٰوۃ کی وضاحت سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ صلٰوۃ کس طرح ایتائے زکٰوۃ کی طرح ڈالتی ہے!

> اے شعیب! کیا تیری صلٰوۃ تجھے یہ حکم بھی دیتی ہے کہ ہم ان کو ترک کریں جن کی محکومیت ہمارے آبا کرتے چلے آئے؟ یا ہم اپنے مال و دولت کو من مانے طریقے سے خرچ نہ کریں؟ (۱۱:۸۷)

اس آیت سے صاف طور پر یہ ظاہر ہے کہ مال و دولت کا قانونِ خداوندی کے مطابق خرچ کرنا صلٰوۃ کا تقاضا ہے اور صلٰوۃ میں داخل ہے۔ گویا صلٰوۃ نہ صرف معاشرتی اونچ نیچ مٹاتی اور حقیقی مساوات و یکجہتی پیدا کرتی ہے بلکہ معاشی مساوات ابھارتی اور غیر ضروری اخراجات پر کنٹرول بھی کرتی ہے جس سے یقیناً ایتائے زکٰوۃ کی بنا پڑتی ہے۔ اب زکٰوۃ کی طرف آئیے۔ زکٰوۃ کا مادہ زکو ہے۔ زَکَاالثَمَالُ وَالزَّرْعُ، یَزْکُوْا، زَکُوًا وَاَزْکٰی کے معنی ہیں مال، کھیتی اور جانوروں کا پھلنا پھولنا، نشو و نما پانا اور بڑھنا۔ اَزْکَی اللّٰہُ الثَمَالَ وَزَکَّاہُ اللہ نے مال کو بڑھایا، زیادہ کیا، نشو و نما دی۔ زَکَاالرَّجُلُ یَزْکُوْ کے معنی ہیں آدمی خوشحال ہو گیا، اس کی صلاحیتوں کی بڑھوتری یا نشو و نما ہو گئی، اس کی زندگی آسودہ اور فارغ البال ہوئی۔ ان معانی سے ظاہر ہے کہ زَکَا یا زَکٰوۃ سے مراد ہے بالیدگی، نشو و نما، انسانی صلاحیتوں کی بھرپور تکمیل اور آسودہ و خوشحال زندگی۔ چونکہ زکٰوۃ، زکو سے مشتق ہے اس لیے زکٰوۃ کے معنی ہیں نشو و نما، بالیدگی، پھولنا پھلنا، انسانی صلاحیتوں کی تکمیل اور زندگی کی شادابی و آسودگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہے کہ اس کے اصطلاحی معانی میں

طہارت و پاکیزگی بھی شامل ہے کیونکہ خود خدا نے اَزْکٰی کو اَطْہَرُ سے صاف صاف الگ کیا ہے۔ مثلاً ”اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْہَرُ (۲:۲۳۲)
ظاہر ہے یہاں ازکٰی سے مراد نشو و نما اور اطہر سے پاکیزگی ہے۔ یہاں بھی زکٰوۃ کے بنیادی معانی صاف جھلک رہے ہیں کیونکہ نشو و نما کے لیے حشو و زوائد سے پاک ہونا ضروری ہے یعنی طہارت کا نتیجہ تزکیہ ہے!

زکٰوۃ اسلام کا معاشی نظام ہے

اس وضاحت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ زکٰوۃ سے مراد وہ معاشی نظام ہے جو قانون الٰہی کے اتباع (اقامت صلٰوۃ) میں قائم کیا جاتا ہے، جس میں ہر معاشی اونچ نیچ کا استیصال ہوتا ہے اور جس میں افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کی یکساں نشو و نما اور زندگی کی ہمہ جہتی مساوات ساز آسودگی و خوشحالی کا سامان ہوتا ہے۔ یہ مومنین کا مقصد زندگی ہے اور اس نظام کے قیام کے بعد انفرادی پس انداز یا ذاتی سرمایہ (Surplus money) کسی کے پاس نہیں رہتا بلکہ سارا زاید سرمایہ ملت کی تحویل میں چلا جاتا ہے:

> (اے رسول!) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کو کتنا کچھ (ملی کاموں کے لیے) کھلا رکھنا ہے؟ کہہ دیجیے کہ تمھاری اپنی ضروریات سے جو کچھ بھی زائد ہو وہ سب کا سب دے دو۔
> (۲:۲۱۹)

قرآن کی رو سے جب کوئی انسان بھی نجی سرمایہ نہیں رکھ سکتا تو ذاتی ملکیت کہاں سے آئے گی؟ اسی طرح، ایک دوسری جگہ صلٰوۃ و زکٰوۃ کا مدعا غیر مشتبہ طور پر یوں واضح فرمایا گیا ہے:

> ایسے لوگوں (مومنین) کو جب تمکن فی الارض حاصل ہوتا ہے تو وہ صلٰوۃ قائم کرتے ہیں اور زکٰوۃ دیتے ہیں (۲۲:۴۱)۔

یہاں دیکھیے کہ مومنین کا فریضۂ حیات زکٰوۃ دینا بتلایا گیا نہ کہ زکٰوۃ لینا۔ ظاہر ہے جب اپنی مملکت میں سب مومن زکٰوۃ دینے پر مامور ہیں تو ان میں سے کوئی بھی زکٰوۃ لے نہیں سکتا! اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی ضابطۂ حیات کے اتباع (اقامت صلٰوۃ) کے بعد تمام مومنین کا مقصد حیات یہ ہوگا کہ اُن کے معاشرے میں ہر فرد کا تزکیہ ہو، یعنی سب کو یکساں نشو و نما ملے، اُس کی ظاہر و مضمر صلاحیتیں پروان

چڑھیں اور اُس کی زندگی متوازن و خوشحال ہو ۔ اس معاشی نظام کا نتیجہ دو گونہ ہوگا ۔ ایک تو یہ کہ اس سے ہر فرد آسودہ ہوگا اور دوسرا یہ کہ فرد سے فرد مل کر (افراد باہم شیر و شکر ہو کر) یکساں نشو و نما سے مالا مال ہوں گے ۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال صرف تب جلوۂ شہود میں آ سکتی ہے جب نہ تو افراد معاشرہ کے مفادات الگ الگ ہوں ، نہ اُن میں تضاد و تصادم کی گنجائش ہو اور نہ نجی سرمایہ اور شخصی ملکیت کی اجازت ہو ۔ اس نظام سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اُسے قرآن ، اَلْجَنّت کہتا ہے ۔

الجنت

اس وقت تک جو کچھ بیان ہؤا اُس پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال کر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اگر قرآن حکیم کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کو بروئے عمل لایا جائے تو نہ کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی کی تحصیل میں سرگرداں ہوگا ، نہ بھوک ہوگی نہ افلاس ، نہ مفادات کا تصادم ہوگا ، نہ سرمایہ داری کی اکاس بیل نوع انسان کے خون پر پروان چڑھے گی اور نہ معاشی و ریاستی غلامی بار پا سکے گی ۔ خوف ہوگا نہ حزن ، بدامنی ہوگی نہ خون خرابہ ۔ بلکہ ، اس کے برعکس، امن و اخوت کی نہر سلسبیل ، ہر قسم کی روک ٹوک سے بے نیاز ہو کر ، اس شانِ دلربائی سے رواں ہوگی کہ ہر جا ، ہر وقت اور ہر نوع کی مدامی اور سدا بہار شادابی و خوشحالی کا دور دورہ ہوگا !

یہ واضح ہے کہ جہاں تک انسان کی دنیوی زندگی کا تعلق ہے اَلجنّت اسی زمین پر ہے (اس وقت حیات بعدالموت اور وہاں کی جنت اور جہنم سے بحث نہیں ہے) الجنت کی دنیوی حیثیت آیت ۲:۳۵ سے عیاں ہے جو پہلے پیش کی گئی ہے ۔ الجنت وہ معاشرہ ہے جس میں بنی نوع انسان زمین کے سامانِ زیست سے اپنی ضروریات ، باہمی فساد اور جذبۂ مسابقت (بڑائی اور برتری جسے تکبّر کہا جاتا ہے) سے مبّرا ہو کر ، حاصل کرتے ہیں ۔ اپنے ابتدائی مرحلے اور سادہ صورت میں الجنت یہ ہے :

اس میں نہ بھوک ہے نہ برہنگی، نہ پیاس ہے نہ دھوپ (۲۰:۱۱۷، ۱۱۸)

یعنی ہر فرد کو اپنی خوراک ، لباس اور مکان کی سی بنیادی

ضروریاتِ زندگی کے حصول کا یکساں حق حاصل ہے۔ ان ضروریاتِ زندگی سے نہ کوئی کسی کو محروم کر سکتا ہے اور نہ باقی افرادِ معاشرہ کو مفلوج و محروم کرکے کسی فرد یا گروہِ افراد کو یہ اختیار ہے کہ خود محلوں میں عیاشی کریں اور سامانِ زیست کو دوسروں سے لوٹ کھسوٹ کر اپنی فوقیت و برتری کو نوعِ انسان میں عدویت کا باعث بنائیں (ملاحظہ ہوں آیات ۳۵،۳۴:۲) ان آیات میں بھی انسانی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ سب کے لیے ہے یکساں، یکرنگ، مساوی اور ہر قسم کی تمیز و تفریق سے مبّرا ہے! پھر، جب انسانی زندگی ترقی کے مدارج پر پہنچے گی تو الجنت کی خصوصیت یہ ہوگی:

> قانون الٰہی کے مطابق عمل کرنے والے مومنوں کو اللہ جنتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہیں۔ یہاں وہ اُن کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے گا اور اُن کا لباس ریشم ہوگا۔ (۲۳ : ۲۲) تم اور تمھارے ازواج الجنت میں داخل ہو جاؤ جسمیں تمھارے واسطے عزت ہے (۴۳:۷۰) وہاں، تمھارے واسطے (خدام) سونے کی رکابیاں اور آبجورے لیے پھرتے ہیں۔ اور وہاں وہ سب کچھ ہے جس کے لیے تمھارا جی چاہے اور جس سے تمھاری آنکھوں کو سرور آئے۔ اور یہ حالت تا ابد (تاوقیتکہ تم قرآنی نظام حیات پر کاربندرہوگے) رہیگی اور کھانے کے لیے میوے ہونگے (۴۳ : ۷۱ ، ۷۲) اور پلنگوں پر سونے کے تکیے جن پر تم آمنے سامنے بیٹھوگے اور غلمان ہمیشہ شرابِ پاک کے آبجورے لیے پھرتے ہونگے۔ اور تو دیکھے تو وہاں نعمتیں پائے گا اور عظیم سلطنت (۵۶ : ۱۵ ، ۱۸) جس کے باسیوں کو باریک سبز ریشم کے ملبوسات اورچاندی کے کنگن میسر ہونگےاور ان کے ربّ کے حکم سے اُن کے لیے پاک و صاف شراب ہوگی (۷۶:۲۰ ، ۲۱)

ان آیات میں بھی الجنت کی زندگی کا اجمالی نقشہ پیش کیا گیا ہے اور خوشحالی و فارغ البالی سب کے لیے یکساں طور پر دکھائی گئی ہے۔ کسی بھی آیت میں تفریق و تخصیص کی کوئی رمق تک نہیں ملتی۔ غرضیکہ ہر قسم کے آرام و آسائش کے بیان کے باوجود جنتی زندگی کے ضمن میں نہ کسی ذاتی ملکیت کا ذکر ملتا ہے اور نہ سرمایہ‌داری، یا، اس

کے برعکس ، غربت و افلاس کا کوئی ادنٰی سا اشارہ ! ہاں ، البتہ ان آیات پر اگر تقابلی غور کیا جائے تو ایک اہم نکتہ واشگاف ہوتا ہے جو یہ ہے کہ آیات ۲۰:۱۱۸،۱۱۷ انسان کی انفرادی مساعی کے متعلق نظر آتی ہیں اورانفرادی مساعی سے یقیناً اتنا ہی کچھ میسر آ سکتا ہے جو ان آیات میں بیان کیا گیا ۔ ان کے برعکس ، دوسری آیات اجتماعی مساعی اور اُن کے انجام کی عکاسی کرتی ہیں ۔ ان سے بہرہ‌ور ہونے والے صرف مومنین (یعنی وہ لوگ) ہیں جو قرآنی نظریۂ زندگی اور ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہونگے ۔ یہ لوگ چونکہ ہم خیال و ہم آہنگ ہوتے ہیں اس لیے ان کی مساعی ، انفرادی مفادات کے تحت، باہم متصادم ہو کر، کشمکش کا باعث نہیں ہوتیں :

اس میں نہ جسمانی محنت و مشقت کی تھکان ہوگی نہ اور ذہنی‌ونفسیاتی کشمکش ! (۳۵:۳۵)

ظاہر ہے آرام و آسائش کی زندگی محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی مگر بایں ہمہ اس آیت میں اگر محنت کی نفی کی گئی ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ افراد معاشرہ کو وہ مشقت نہیں کرنی پڑیگی جو باطل یا غیر قرآنی نظامہائے زندگی میں ہر فرد کے لیے مقدر ہوتی ہے ۔ ان نظاموں میں کوئی فرد کسی دوسرے کا ممد و معاون نہیں ہوتا ، ہر کوئی اپنی ضروریات کا خود ذمہ‌دار ہوتا ہے ۔ ایسے میں ذہنی کشمکش اور الم و کرب ہر فرد کے لیے لابدی بن جاتے ہیں ۔ پھر "النَّصَبُ" سے "النَّصِیْبُ" کا لفظ بھی ہے جس کے معنی حصے کے ہیں ۔ اس اعتبار سے قرآنی معاشرے میں نہ کسی کو کوئی جدا حصہ ملتا ہے اور نہ کوئی ملکیت جس کے بنانے یا حاصل کرنے کے لیے ذہنی گٹھ جوڑ اور بھاگ دوڑ کی جائے !

اس قسم کے معاشی نظام کے نفاذ اور اس کی برکتوں اور فوائد سے بہرہ ور ہونے کے لیے مملکت یا ریاست کا وجود ناگزیر ہے ۔ اس لیے قرآن حکیم بھی اس کے حصول و قیام کو ضروری قرار دیتا ہے ۔

اسلامی مملکت

اور انھوں نے کہا حمد ہے اُس اللہ کی جس نے ہمارے ساتھ اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کیا ۔ اور ہم کو زمین کی وراثت عطا کی ۔ یہ وہ الجنت ہے جس میں ہمارا اپنا عمل دخل

ہے - اور قانونِ الٰہی کے مطابق عمل کرنے والوں کے لیے
یہ کتنا ہی عمدہ اجر ہے! (۳۹:۷۴)

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے اس دنیا میں ، الجنت وہ مملکت ہے جس میں قرآنی معاشی نظام نافذ ہوگا ، جس میں رہنے والے تمام افراد ہر قسم کے غیر خدائی بندھنوں سے آزاد اور ہر لحاظ سے باہم برابر اور بھائی بھائی ہونگے (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹:۱۰)

قرآنی ادارۂ امارت

اسلامی مملکت میں رہنے والے اخوان کی مساعی کو منظم اور مفید الناس بنانے کے لیے قرآنی ادارۂ امارت قائم کیا جاتا ہے تاکہ افرادِ معاشرہ کو اپنی انفرادی اور اجتماعی ربوبیت کی ضمانت ملے اور وہ اُن کی محنت کے ماحصل کو اپنی تحویل میں لے کر سب کی ضروریات زندگی کی کفالت کرے ، افرادِ معاشرہ کی استعدادِ کار میں لازمی فرق اُن کی ضروریات کے حصول اور معاشری مساوات میں مخل نہ ہونے پائے ، حالات کی مساعدت و نامساعدت ، شباب و پیری ، صحت و علالت کسی بھی فرد اور اُس کے لواحقین پر معاشی جہت میں اثر انداز نہ ہونے پائیں اور سب کو اُن کی ضروریاتِ زندگی اور زندگی کی مساوی آسائشیں یکساں طور پر میسر ہوں - چنانچہ اسلامی مملکت میں مومنین اس مقصد کے لیے ادارۂ امارت قائم کر کے اس سے یہ عہد و پیمان کرتے ہیں :

یقیناً اللہ نے مومنین سے اُن کی جان و مال خریدے اور اس کے
عوض اللہ اُن کو الجنت دیتا ہے - (۹:۱۱۱)

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے الجنت وہ مملکت ہے جس میں قرآنی معاشی نظام کا دور دورہ ہوتا ہے - اس خرید و فروخت میں اللہ سے مراد قرآنی ادارۂ امارت ہے جو اللہ کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات (قرآن) کے نفاذ پر مکلف ہے - دوسرے الفاظ میں ، اس سے مراد وہ مرکزی نظام اسلامیہ ہے جو افراد مملکت (مومنین) میں معاشی اشتراکیت اس طور پر قائم کرتا ہے کہ ہر فرد کی محنت کے ماحصل کو خزانۂ عامرہ (بیت المال) میں جمع کرتا ہے اور سب کی ضروریات زندگی کو مساوی پیمانے پر ، اُن کی کمائیوں میں کمی و بیشی کے باوصف ، پوری کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے - ظاہر ہے جب کوئی بھی فرد اپنی کمائی کو الگ نہیں رکھ

سکتا تو ایسے میں ذاتی ملکیت بنانے اور اس پر سرمایے کے انبار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی اسلامی معاشرے میں نہ مفادات کا تصادم ہوتا ہے ، نہ دوسرے افرادِ معاشرہ کو نظرانداز کر کے کسی فرد کے لیے ایسی جسمانی مشقت کی ضرورت ہوگی جو ایک طرف دوسرے افرادِ معاشرہ کے لیے موجب فساد ہے تو دوسری طرف ، خود فردِ متعلقہ کے لیے ذہنی کشمکش اور جسمانی کرب کی مصیبت لاتی ہے۔

اولاد کے رزق کی ذمہ داری

یہ نظام چونکہ فلاحِ عامہ کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس میں صرف افرادِ کار کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت نہیں ہوتی بلکہ اُن کے ہوتے ہوئے اور ، پھر ، اُن کی وفات کے بعد بھی ، اُن کے اہل و عیال کی عین اُس طرح نگہداشت اور پرورش ہوتی ہے جس طرح اُن افراد کی زندگی میں ہوتی تھی :

ہم تم کو بھی رزق مہیا کرتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔
(۶:۱۵۲)

غور کیجیے کہ قرآنی معاشی نظام میں جب یہ گارنٹی موجود ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی اولاد کے رزق اور ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری بھی مرکز پر ہے تو پھر اسلامی مملکت میں رہنے والے لوگ آخر اس اندیشے کے تحت چوری چھپے یا طوعاً و کرہاً ذاتی ملکیت بنانے کی جانکاہ مشقت میں پڑنا گوارا کریں گے ؟ ظاہر ہے انفرادی مساعی سے اگر کوئی بڑی جائداد یا ملکیت بنائی بھی جائے تو اس کے ثبات و بقا کی کوئی گارنٹی نہیں ہو سکتی ! انسانی تاریخ بجائے خود اس حقیقت کی شاہدِ عادل ہے کہ دولت و ثروت اور اقتدار و حکومت نہ تو کسی فرد کے پاس مدامی طور پر رہے اور نہ کسی خاندان کو ہمیشہ کے لیے میسر آئے بلکہ انفرادی اور گروہی متضاد مفادات ہمیشہ متصادم ہوتے رہے اور اس لیے دولت و حکومت بھی گھر بدلتی رہیں۔ ایسے معاشی نظام پر اگر کوئی معاشرہ متشکل ہو تو پھر وہ کونسا احمق ہوگا جو اس کے مقابلے میں کوئی اور نظامِ زندگی پسند کرے ؟

نہ کوئی تنہا ہوگا نہ بےبس

قرآن حکیم پورے وثوق سے کہتا ہے کہ سابقہ معاشرے اس لیے

تباہ ہوئے کہ اُن کے ہاں یتامٰی و مساکین کی معاش و تکریم کی کوئی گنجائش نہ تھی :

> (نہیں) بلکہ اُن کی تباہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ تو یتیم کی تکریم کرتے تھے اور نہ مسکین کے طعام کا بندوبست کرتے تھے !
> (۸۹:۱۷،۱۸)

ان دو آیتوں میں یتیم اور مسکین کے الفاظ قابل غور ہیں۔ عربی میں یتیم صرف اس کو نہیں کہتے جس کا باپ مر جائے بلکہ اس کے بنیادی معنی ہیں تنہا و بے مددگار انسان۔ اسی طرح ، مسکین ، مسکنٌ ، ساکنٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ایسا انسان جس کی حرکت رک جائے ، جس کا کاروبار بند ہو جائے ، جس میں کام کرنے کی اہلیت و صلاحیت نہ رہے ، جو متحرک سے ساکن ہو کر رہ جائے۔ ان معانی سے ظاہر ہے کہ قرآن جب سابقہ معاشروں کے زوال و تباہی کا ایک اہم سبب بے کس اور بے وسائل لوگوں کی ذلت و کس مپرسی کو قرار دیتا ہے تو اس کا دیا ہؤا معاشی نظام لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ اس میں نہ تو کوئی فردِ معاشرہ تنہا و بے مددگار ہو کر مقامِ شرفِ وجود سے گرے گا اور نہ کسی کا چلتا ہؤا کاروبار محض اس لیے رکے گا کہ یا تو وہ خود کسی آفاقی حادثے کا شکار ہؤا یا اس کی مالی حالت ابتر ہوگئی۔ نہیں بلکہ قرآنی نظامِ حیات میں ایسی صورت حال پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ کوئی فرد چاہے صحتمند ہو یا علیل ، کوئی بڑا گروہ اپنے ساتھ رکھتا ہو یا فرد واحد ہو ، اس میں ایسی اضافی نسبتوں کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ اس کی قدر و منزلت اور رزق و طعام میں ان امور کے باعث نہ کوئی فرق آنے پائے گا اور نہ وہ اُن سے محروم ہوگا۔ بلکہ اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ، ان امور کے علی الرغم ، دیگر افرادِ معاشرہ کے عین برابر ، مہیا ہوتی رہیں گی :

> صلٰوۃ گذار وہ ہیں جن کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا جانا اور مانا ہؤا حق ہے (۷۰:۲۴) -

سائل اسکو کہتے ہیں جسکی ضروریات زندگی کے پورا ہونے میں کسی وجہ سے کمی رہ جائے ، اور محروم وہ ہے جو اپنی ضروریات کو خود پوری کرنے کی اہلیت و صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ قرآنی معاشی نظام ایسے جملہ افرادِ معاشرہ کو اس عہد و پیمان کے مطابق ، جو مرکز اور

افرادِ معاشرہ کے مابین (دیکھیے پہلے بیان شدہ آیت ، ۹:۱۱۱) طے پاتا ہے ، اُن کی ضروریات زندگی کو مہیا کرنے کا ذمہ‌دار ہے - ایسے جملہ افراد اور ان کے لواحقین کو عین اُس پیمانے سے اُن کی ضروریاتِ زندگی ملتی رہیں گی جس سے دوسرے اہلِ کسب و ہنر اور کام کرنے والوں کو ملتی ہیں - یہ ہے جنتی معاشرہ !

نار جہنم

جنتی معاشرے کے برعکس ، جس معاشرے میں اکتنازِ مال و دولت (سرمایہ داری) کا چلن ہوتا ہے اُس کو قرآن جہنم سے تعبیر کر کے اُسکی صاف صاف ممانعت کرتا ہے :

> اور جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اُن کو عوامی فلاح کے لیے عام نہیں ہونے دیتے ان کو الم انگیز خبر دو - اس نظام کو نہ تو پہلے بقا حاصل ہوئی اور نہ ہی اب ہوگی - یہ ، اُس آگ کا ایندھن ہونگے جس سے ان کی پیشانیاں ، پہلو اور پیٹھیں داغ دی جائیں گی - اور (اُس وقت) اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے اُس مال کا انجام جسے تم (دوسروں کو محروم کر کے) اپنے واسطے جمع کرتے تھے - اب اپنے جمع کیے ہوئے کا مزہ چکھو ! (۹:۳۴،۳۵) -

یوں تو جہاں تک سرمایہ داری اور ایسی ذاتی ملکیت کا تعلق ہے جو سرمایہ درای پر منتج ہو ، ان آیات سے اُن کی ممانعت اس قدر واضح ہے کہ اس معاملے میں مزید کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہوگی مگر مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ مُلا نے قرآن کو ایک طرف تو ان کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اُسے برہمن اور پوپ کی تقلید میں اپنی میراث بنایا اور دوسری طرف ، ستم بالائے ستم، قرآن کو انسانی زندگی اور اس کے دنیوی تعلقات و معاملات سے غیر متعلق قرار دے کر اس کی ہر آیت کو ” حیاتِ آخرت “ کے لیے مخصوص رکھا - ایسے ہی معانی ان آیتوں کو بھی دیے گیے - ان حالات میں ان آیات میں آئی ہوئی قرآنی اصطلاحات ” الم “ ” نار “ اور ” جہنم “ کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ آیات، بنیادی طور پر ، اس دنیوی زندگی سے متعلق ہیں -

اَلَمٌ اور اَیلَمَۃٌ کے معنی درد کے ہیں ۔ اَلِیۡمٌ کے معنی ہیں درد پہنچانے والا ۔ لہذا ، عَذَابٌ اَلِیۡمٌ کے معنی ہیں درد پہنچانے والا عذاب ۔ پھر عَذَابٌ ، عِذۡبٌ سے ہے جو عَذۡبٌ بھی ہوتا ہے ۔ اس کے تین مختلف معانی ہیں (۱) پانی کی مٹھاس اور خوشگواری جو پیاس کو بجھاتی ہے (۲) تکلیف اور دکھ جو زندگی کی خوشگواری میں خلل انداز ہو اور (۳) بندش ، ممانعت اور رکاوٹ ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ تینوں حالتیں انسان کی زندگی سے متعلق ہیں ۔ پانی اور دنیا کی دیگر جملہ اشیائے استعمال انسان کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے ہیں۔ مگر جب ایسا نظام قائم کیا جائے جو اُن کے حصول میں غیر فطری رکاوٹیں پیدا کرے تو یہ صورتِ حال زندگی میں ناخوشگواری ، تکلیف اور فساد پیدا کرتی ہے جس کا نتیجہ دکھ اور درد ہی ہوتا ہے ۔ اب ”نار“ کو لیجیے ۔ نارٌ کے معنی ہیں شعلے کی وہ لپٹ جو نظر آئے ۔ اس کے معنی میں نفرت و وحشت بھی شامل ہیں - مثلاً نَارَتِ الۡمَرۡأَۃُ تَنُوۡرُ عورت کے متنفر اور متوحش ہونے کو کہتے ہیں ۔ نَائِرَۃٌ عداوت ، بغض اور فتنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح، جَہَنَّمُ کو دیکھیے۔ محققین کے نزدیک یہ لفظ اپنی اصل میں عربی نہیں، بلکہ عبرانی ہے اور عبرانی کے دو الفاظ ”جیہ“ اور ”ھَنُوم“ کا مجموعہ ہے ۔ ”جی“ وادی کو کہتے ہیں اور ”ہنوم“ ایک آدمی کا نام تھا ۔ زمانہ قدیم میں یروشلم کے جنوب میں ایک وادی کو وادیٔ ہنوم کہتے تھے ۔ اُس زمانے میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کا عام رواج تھا ۔ ایک دیوتا ”مولوک“ کہلاتا تھا جسکو خوش کرنے کے لیے وادیٔ ہنوم میں انسانوں کو جلایا جاتا تھا ۔ اس اعتبار سے قرآن کی رو سے جہنم وہ جگہ یا معاشرہ ہے جس میں انسانیت باطل نظامہائے حیات میں پھنس کر مال کی تحصیل میں باہمی بغض وعداوت کی شکار ہو کر جل بھن کر رہ جاتی ہے !

قرآن حکیم نے ان آیات میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی ہے کہ مال و دولت کو ، جو اپنی اصل میں نوعِ انسان کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے ہے (عِذۡبٌ) اگر چند ہاتھوں میں روک دیا جائے (عَذَبٌ) تو اس کا نتیجہ معاشرے میں بغض ، عداوت اور فتنہ و فساد ہوگا (نَارٌ) اور اس سے انسانی زندگی بجائے خوشگوار ہونے کے ناخوشگوار اور کرب و

الم کی آماجگاہ بن جائے گی (عَذَابٌ وَّ اَلِیْمٌ) جب یہ صورتِ حال عام ہو تو اس سے انسانیت اُس شے (مال و دولت) کی بھینٹ چڑھ جائے گی جو در اصل سب کے لیے ہے اور بالآخر نوعِ انسان فساد و بدامنی کی آگ میں جل کر تباہ ہوگی (جَہَنَّمْ) - سچ تو یہ ہے کہ یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ دو آیتوں میں اس نے انسان کی ساری تاریخ کا ماحصل پیش کر کے علم و عقل کی بنا پر یہ تنبیہ کر دی کہ شروع سے لے کر آج تک انسان نے اپنے زعم باطل میں جو بے شمار معاشرے قائم کیے، اس نے جسقدر بھی تہذیبیں بنائیں اور جو گوناگوں نظامہائے حیات رائج کیے وہ سب مال ہی پر مبنی رہے اور مال ہی انسان میں عداوت، فساد اور جنگ و جدل کا موجب رہا - جہاں اور جب بھی اکتناز نے جنم لیا وہ معاشرہ تباہ ہؤا اور اب اگر کوئی قوم ایسا کرے گی تو سوائے ذلت و تباہی کے کچھ نہ پائے گی! غرضیکہ ان آیات سے سرمایہ داری کی صاف صاف ممانعت کی گئی ہے اور اُسے جَہَنَّم قرار دیا گیا ہے!!

مثالی معاشرہ

جناب رسالتمآبؐ اور حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ نے ان بنیادی اصولوں کے مطابق مملکت اسلامیہ کی تشکیل فرمائی۔ حضورؐ نبی بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی - مگر تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی حضورؐ کی زندگی عام مسلمانوں کی سی رہی - حضورؐ کو گزارے کے لیے باغ فدک دیا گیا تھا اور آپ کی وفات کے بعد وہ بھی ملّت نے اپنی تحویل میں لے لیا - اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں ایسی ملکیت جس کی وراثت ہو صاف صاف ممنوع ہے - یہی سنّتِ رسول ہے اور یہی قرآنی ضابطۂ حیات پر مبنی معاشرہ ہے - حیرت ہے کہ جولوگ سنت کی پیروی پر اتنا زور دیتے ہیں وہ حضور کی یہ بنیادی اور مثالی سنت کیوں نہیں مانتے؟ اسی طرح، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ جب یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی نہ تو مملکت میں کوئی جائداد بنائی نہ اپنی کوئی جاگیر قائم کی، نہ اُن کے مشاہرات دیگر مومنین سے زیادہ تھے اور نہ ہی اُن کے رہن سہن کو کوئی امتیاز حاصل تھا۔ ان کے سمیت، سب مومن برابر اور معاشری اور معاشی حیثیت سے باہم بھائی بھائی تھے - یہ ہے وہ مثالی معاشرہ جو قرآنی ضابطۂ

حیات پر قائم ہؤا ، جسے دنیا نے ایک نہایت ہی مختصر وقت کے لیے دیکھا اور جس میں ہر قسم کی اونچ نیچ ناپید تھی ! اور یہ سب کچھ اس لیے ہؤا تھا کہ مال پر مبنی منافشت کا استیصال کیا گیا تھا !!

غور کیجیے کہ جس معاشرے میں ایسا معاشی نظام قائم ہو جس میں جملہ افرادِ معاشرہ علٰی وجہ البصیرت اپنے آپ کو بھائی بھائی مانیں، جو انفرادی لوٹ کھسوٹ ، تحصیلِ مال اور اس کی حفاظت و نجی ارتکاز کے خطروں سے آگاہ ہو کر ایسی مالی اشتراکیت وجود میں لائیں جسمیں تمام افراد ، ان کے لواحقین ، ان افراد میں سے معذور اور (مروجہ معانی میں) بے کس و بے بس لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کے بے روک و ٹوک مہیا ہونے کا بندوبست ہو گیا وہاں ذاتی ملکیت کو، جو ایسے نظام کے بغیر ہر وقت تاخت و تاراج اور زوال و زیاں کی زد میں ہوتی ہے ، بنانے یا اس کے قائم رکھنے کا کوئی عقلی جواز ہو سکتا ہے ؟ قرآن حکیم نہایت ہی ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل اور تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ شروع سے لے کر آج تک نوعِ انسان میں وجہِ اختلاف و عدویت ، بنیادی طور پر ، مال ہی رہا ہے۔ مال وہ جنسِ عظیم ہے جس کی سب کو ضرورت ہے اور جس پر سب کی زندگی اور اس کی آسائشوں کا دارومدار ہے، مگر ابلیسیت ہے تو اسی سے ہے (ملاحظہ ہو ، ۲:۳۴) اور شیطنت ہے تو اسی سے ہے (۲:۳۵) پھر چونکہ مال و رزق زمین سے حاصل ہوتا ہے اور زمین منجانب اللہ سب کے لیے ہے اس لیے قرآن زور دے کر کہتا ہے وَكُلَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲:۳۵) ’’ اور جیسا تمہارا جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ پیو ‘‘ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر فرماتا ہے :

> خدا کے دیے ہوئے رزق سے کھاو پیو اور زمین میں فساد مت مچاؤ (۲:۶۰) ۔

گویا رزق ، کھانے پینے یعنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے ہے ۔ یہ نہ اکتناز کے لیے ہے اور نہ ضروریاتِ زندگی کے علاوہ اس کا کوئی اور مدعا ہے۔ قرآن کی اس حد سے تجاوز فساد فی الارض ہے۔ غرضیکہ قرآنی معاشی نظام کے مطابق زمین اور اس کے مال و رزق سے صرف ضروریاتِ زندگی کی تحصیل و تکمیل کی اجازت ہے ۔ اس میں سرمایہ جوڑنے ، نجی ملکیت بنانے اور مومنین میں معاشی اور معاشری اونچ نیچ پیدا

کرنے کی اجازت کسی بھی صورت نہیں دی گئی ۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا نتیجہ اختلاف وعداوت ہوگا اور امن و اخوت ناممکن ہوگی !

آپ کو اتفاق ہوگا کہ یہ مضمون ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے ۔ اس مختصر سے مقالے میں جو کچھ پیش کیا گیا اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے ۔ اگر قرآن حکیم کی پوری تعلیم کو پیش کیا جائے تو کسی بھی صاحب علم و عقل انسان کو قرآنی نظامِ حیات پر مبنی مملکت میں سرمایہ جوڑنے اور ذاتی ملکیت بنانے کا کوئی ادنٰی سا اشارہ بھی نہیں ملے گا کہ یہی فساد فی‌الارض کی بنیاد ہے اور اسی سے نوعِ انسان کی وحدت پارہ پارہ ہوئی، آج پارہ پارہ ہو رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی !!

* * *

ساحل تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے

انسانی زندگی کی کشتی کو چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے نیچے اتنا پانی ہو جو اسے خوبی سے تیرا سکے ۔ اس سے زیادہ مقدارِ آب کی کشتی کو ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس کے نیچے مزید سو پچاس گز گہرا پانی ہو یا پانچ میل گہرا سمندر وہ سب فالتو پانی ہے ۔ کشتی کی روانی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ ضرورت سے زیادہ مال کی حرص جب انسان کے دل کے اندر داخل ہو جاتی ہے تو وہ زندگی کی خرابی کا باعث ہوتی ہے ۔ بعینہ جیسے پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اسے ڈبو دیتا ہے۔ زندگی کے فطری اور حقیقی مقاصد کے لیے بقدر ضرورت مال لازمی ہے ۔ پیغمبروں کو بھی استحکام دین اور اشاعت دین کے لیے کچھ مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مال اہل دل کے لیے ذریعہ خیر ہوتا ہے وہ خود مقصد نہیں بن جاتا ۔ دل کے اندر مال کا کوئی مقام نہیں ۔ ضرورت کے مطابق مال رحمت ہے اور ضرورت سے زیادہ زحمت اورآفت ہے ۔

مال اگر دینی حدود کے اندر ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وہ باعث خیر ہوگا ۔ اس سے دنیا و آخرت دونوں ہی سدھر جائیں گی اور اگر دل کے تمام گوشوں میں مال ہی کی محبت سما جائے تو یوں سمجھو کہ دریا کا پانی کشتی کے اندر آ گیا جو اسے لے ڈوبے گا حالانکہ یہی پانی اگر کشتی کے نیچے رہتا تو اہل کشتی کو ساحل تک پہنچانے میں بہترین معاون ہوتا ۔

نظر علی شاہ

معاشی نظام — اسلام کے آئینے میں

اسلام صرف اخلاق کی باتوں یا عبادات کا نام نہیں ہے۔ عبادات (پوجا پاٹ) تو سب مذہبوں میں ضروری ہیں۔ دین اسلام کا بھی ایک لازمی حصہ اس دنیا کے بعد آخرت کی زندگی پر ایمان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی موت سے جسم تو ختم ہو جاتا ہے مگر روح برابر زندہ رہتی ہے۔ جس طرح جسم کی پرورش کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم خوراک کھائیں تو ہمارے جسم کی نشوونما ہوتی ہے اسی طرح روح کی نشوونما کے لیے بھی غذا کی ضرورت ہے اور روح کی غذا پوجا پاٹ سے زیادہ یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ محنت و کوشش کر کے کمائیں اور دوسروں کی پرورش کے لیے اُسے خرچ کریں۔ جس قدر ہم زیادہ دوسروں کی بہتری کے لیے بغیر، دنیوی لالچ کے، خرچ کریں گے اُسی قدر زیادہ روح کی نشوونما ہوگی اور جسمانی موت کے بعد ہمیں اجر ملے گا۔ میرے نزدیک یہی صحیح اسلام ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نبی کریم صلعم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضورؐ کی سیرت، احادیث رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے حالات کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہے کہ انھوں نے جسمانی نشوونما سے زیادہ اپنی روح کی نشوونما کے لیے کوشش کی اور اقامت صلوٰۃ کا مقصد محض پنجگانہ نماز نہیں بلکہ یتیم و مسکین کے ساتھ معاشی مساوات برتنے کو سمجھا۔ اُن لوگوں نے صحیح اسلام کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کیں اور تمام عمر جو کچھ کمایا وہ سب دوسروں کے لیے خرچ کر دیا۔

اسلام سے بڑا سوشلزم کا علمبردار کون ہو سکتا ہے؟ اسلام میں سرمایہ داری کو جائز قرار دینے والوں کی معلومات کے لیے چند احکام خداوندی، احادیث رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کے چند واقعات درج کیے جاتے ہیں۔ حضور نبی کریمؐ کی زندگی ہی صحیح اسلام ہے۔ اور آج تک کوئی دشمن بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ حضور نے سرمایہ دار

کی سی زندگی بسر کی ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف عالمانہ تاویلوں سے ، مسلمان رہتے ہوئے ، سرمایہ داری کو کیسے جائز بتایا جا سکتا ہے ؟

احکام خداوندی

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں اس دن کے درد ناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے جب اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اُس سے اُن کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے جمع کیا تھا سو اس کا مزہ چکھو ۔

سورہ التوبہ ، آیت ۳۴ ، ۳۵

اور زمین پر کوئی چلنے والا نہیں مگر اس کی روزی اللہ پر ہے ۔

سورہ ھود ، آیت ۶

ہم تمھیں اور اُنھیں (تمھاری اولاد کو) رزق دیں گے ۔

سورہ الانعام ، آیت ۱۵۱

(یاد رہے کہ خدا کے رزق پہنچانے کی ذمہ داری اس حکومت پر عائد ہوتی ہے جو خدا کے نام پر قائم کی جاتی ہے اور خدا اپنی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں ہی پوری کراتا ہے اور اگر کچھ انسان یہ ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے تو انھیں تباہ و برباد کر کے ، ان کی جگہ ، اپنے دوسرے بندے فائز کر دیتا ہے)

انسان اسی چیز کو بطور حق کے لے سکتا ہے جس کے لیے وہ محنت کرے ۔

سورہ النجم ، آیت ۳۹

اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کے راستے میں) کیا خرچ کریں، کہہ دیجیے کہ جو (تمھاری اپنی ضروریات سے) زائد ہو (سب کا سب) ۔

سورہ البقرہ ، آیت ۲۱۹

تو کہتا ہے میرے رب نے تجھے ذلیل کیا ، ہر گز نہیں ، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو اور میت کا ترکہ سب سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت

زیادہ محبت رکھتے ہو۔

سورہ الفجر ، آیات ۱۶ تا ۲۰

(لوگو) تمھیں (مال کی) بہت سی حرص نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں ۔ ایسا نہیں چاہیے، آئندہ تم جان لو گے ۔

سورہ التکاثر ، آیت ۱ تا ۳

ہر غیبت کرنے والے ، طعنہ دینے والے کے لیے ہلاکت ہے جو مال کو جمع کرتا ہے اور اسے گنتا رہتا ہے ۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے بقا بخشے گا ۔ ہرگز نہیں ۔ وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا اور آپ کو کیا معلوم حطمہ کیا ہے ۔ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک جا پہنچتی ہے ۔ بے شک وہ ان پر چاروں طرف سے مسلط کر دی جائے گی ، لمبے لمبے ستونوں کی شکل میں ۔

سورہ الھمزہ ، آیات ۱ تا ۹

احادیث رسول صلعم

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری کے لیے زائد اونٹ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہیں۔ جس کے پاس زائد زادِ راہ ہو وہ اُسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہیں ۔ حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ اس طرح مختلف اموال کا ذکر فرماتے چلے گئے حتٰی کہ ہم نے محسوس کر لیا کہ ضرورت سے زائد مال رکھنے کا ہم میں سے کسی کو حق نہیں ۔

”تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک آدمی سے صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے“

(مسند احمد ، جلد ۳)

”دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں وہ اس قدر فساد برپا نہیں کرتے جس قدر انسان کی دولت اور مرتبے کی حرص اُس کے دین میں فساد ڈالتی ہے ۔“

(ترمذی)

”جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات

بھر بھوکا رہا تو اس بستی سے اللہ کی حفاظت ونگرانی کا ذمہ ختم ہؤا ۔"

(مسند امام احمد)

حضرت ابو موسیٰ رضؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلے والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینے میں ان کے بال بچوں پر فاقے کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے ۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ " یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں ۔"

(بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا ، نہ درہم ، نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کوئی چیز سوائے اپنے ایک سفید خچر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا ۔

(بخاری)

" میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا ، میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا " ۔

(بخاری)

حضرت رافع بن خدیج رضؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلعم کے زمانے میں زراعت کے لیے تہائی ، چوتھائی ، یا غلے کی کوئی مقدار متعین کر کے زمینیں بٹائی پر دیتے تھے ۔ ایک روز میرے ایک چچا میرے پاس آئے اور کہا کہ رسول اللہؐ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روکا ہے جو ہمارے لیے نفع بخش ہے ۔ حضور رضؓ نے ہمیں اس بات سے منع کر دیا ہے کہ ہم مزارعت کا معاملہ کریں یعنی تہائی ، چوتھائی یا مقررہ مقدار کے غلے کے عوض زمین کو بٹائی پر دے دیں ۔ آپؐ نے حکم دیا ہے کہ مالک زمین خود کاشت کرے یا کسی دوسرے بھائی کو کاشت کے لیے دے دے ۔ اور آپؐ نے زمین کے کرائے کو اور دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے ۔

(مسلم)

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں ۔ اس لیے اللہ کی زمین ، اللہ کے بندوں کے لیے رہنی چاہیے ۔

(ابو داؤد)

"جو شخص اس غرض سے غلہ جمع کر کے روک لے کہ نرخ بڑھنے پر بیچے تو وہ بڑا خطا کار ہے ۔"

(مسلم و ابو داؤد و الترمزی)

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میرے رب نے مجھے پیشکش کی کہ میرے لیے مکے کے پہاڑوں کو سونے کا بنا دیا جائے ۔ میں نے عرض کیا اے اللہ ! مجھے تو یہ پسند ہے کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں تو دوسرے دن بھوکا رہوں تاکہ جب بھوکا رہوں تو زاری کروں اور تجھے یاد کروں اور جب پیٹ بھروں تو تیرا شکر کروں ، تیری تعریف کروں ۔

(ترمزی)

حضرت ابو ذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میں نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہؤا ، اس وقت آپ کعبے کے سایے میں بیٹھے تھے ۔ جب آپ کی نظر مجھ پر پڑی تو فرمایا " وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے " ۔ میں نے کہا " میرے ماں باپ آپ پر قربان ! کون لوگ تباہ و برباد ہوگئے" ۔ آپ نے فرمایا " وہ تباہ و برباد ہوگئے جو مالدار ہونے کے باوجود خرچ نہیں کرتے ۔ کامیاب وہی ہوگا جو اپنی دولت کو لٹائے ، سامنے والوں کو دے ، پیچھے والوں کو دے ، دائیں اور بائیں جانب والوں کو دے اور ایسے مالدار خرچ کرنے والے تو بہت ہی کم ہیں ۔"

(بخاری و مسلم)

" کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتلاؤں جو درجے میں نماز ، روزے اور صدقے سے بڑی ہے ؟ " سامعین نے کہا فرمائیے ۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا " ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کرنا ۔ "

(ابو داود و ترمزی)

"اے ابن آدم اگر تو فالتو مال (جو تیری ضروریات سے زائد ہو) خرچ کرے تو تیرے لیے بہتر ہے اور اگر تو اسے دبا رکھے یعنی خرچ نہ کرے تو تیرے لیے بہت برا ہے ۔ اور روزمرہ ضروریات پر خرچ کرنا کوئی عیب نہیں اور (مروت کرنے میں) اپنے تعلق داروں سے ابتدا کرو

اور یاد رکھو اونچا ہاتھ (یعنی دینے والا) نیچے ہاتھ (یعنی لینے والے) سے بہتر ہے۔"

(مسلم و ترمزی)

ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو ارشاد فرماتے سنا کہ وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی جو اس کے پہلو میں رہتا ہے بھوکا رہے۔

(مشکٰوۃ)

حکایات صحابہ

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے اور اسی سے گزر اوقات تھا۔ جب خلیفہ بنائے گئے تو حسب معمول صبح کو چند چادریں ہاتھ پر ڈال کر بازار میں فروخت کے لیے تشریف لے گئے۔ راستے میں حضرت عمر رضؓ ملے۔ پوچھا "کہاں چلے" فرمایا "بازار جا رہا ہوں۔" حضرت عمر رضؓ نے عرض کیا کہ "اگر آپ تجارت میں مشغول ہوگئے تو خلافت کے کام کا کیا ہوگا۔" فرمایا "پھر اہل و عیال کو کہاں سے کھلاؤں۔" عرض کیا کہ ابو عبیدہ جن کو حضور نے امین ہونے کا لقب دیا تھا اُن کے پاس چلیں، وہ آپ کے لیے بیت المال سے کچھ مقرر کر دیں گے۔ دونوں حضرات ان کے پاس تشریف لے گئے تو اُنھوں نے مدینے کے ایک مزدور کو جو اوسطاً ملتا تھا، نہ کم نہ زیادہ، وہ مقرر فرما دیا۔

ایک مرتبہ بیوی نے درخواست کی کہ کوئی میٹھی چیز کھانے کو دل چاہتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر نے کہا میرے مالی حالات اس قابل نہیں کہ تمھاری اس تمنا کو پورا کر سکوں۔ بیوی نے عرض کیا کہ بیت المال سے آپ کو جو وظیفہ ملتا ہے اجازت ہو تو اس سے کچھ بچا کر کوئی میٹھی چیز پکا لوں اور بچوں کو کھلا دوں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ کچھ عرصے کے بعد بیوی نے پس انداز کر کے تھوڑا سا حلوہ تیار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تجربے سے معلوم ہوا کہ اتنی مقدار ہمیں بیت المال سے زیادہ ملتی ہے۔ اس لیے آئندہ کے لیے اتنی مقدار جتنا بیوی نے روزانہ پس انداز کیا تھا اپنی تنخواہ میں سے کم کر دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا وصال ہونے لگا تو حضرت عائشہ رضؓ کو وصیت فرمائی کہ میری تحویل میں جو چیزیں بیت المال کی ہیں وہ میرے بعد آنے والے خلیفے کے حوالے کر دی جائیں۔ حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی دینار یا درہم نہیں تھا، ایک اونٹنی دودھ کی، ایک پیالہ، ایک خادم تھا۔ بعض روایات میں ایک اوڑھنا اور ایک بچھونا بھی آیا ہے۔ یہ اشیاء جب حضرت عمر رضؓ کے پاس پہنچیں تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابوبکر رضؓ پر رحم فرمائیں کہ اپنے بعد والے کو مشقت میں ڈال گئے۔

ابن سیرین کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق کی جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا کہ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ بیت المال سے کچھ لوں مگر عمر رضؓ نے نہ مانا کہ دقت ہوگی اور تمہاری تجارت کی مشغولی سے مسلمانوں کا حرج ہوگا، اس مجبوری سے مجھے لینا پڑا۔ اس لیے اب میرا فلاں باغ اس کے عوض میں دے دیا جائے۔ جب حضرت ابوبکر کا وصال ہوگیا تو حضرت عائشہ نے حضرت عمر کے پاس آدمی بھیجا اور والد کی وصیت کے مطابق وہ باغ دے دیا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے باپ پر رحم فرمائیں، انہوں نے یہ چاہا کہ کسی کو لب کشائی کا موقع ہی نہ دیں۔ (کتاب الاموال)

حضرت عمر رضؓ

حضرت عمر رضؓ بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ جب خلیفہ بنائے گئے تو بیت المال سے وظیفہ مقرر ہؤا۔ مدینہ طیبہ میں لوگوں کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں تجارت کیا کرتا تھا، اب تم لوگوں نے خلافت میں مشغول کر دیا اس لیے اب گذارے کی کیا صورت ہو؟ لوگوں نے مختلف مقداریں تجویز کیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ چپ بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضؓ نے دریافت فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ آپ نے فرمایا جو آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو اوسطاً کافی ہو جائے وہ لے لیجیے۔ حضرت عمر نے اس رائے کو پسند فرمایا اور قبول کر لیا اور اوسط مقدار تجویز ہو گئی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ ایک مجلس میں، جس میں خود حضرت علی بھی تھے اور حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، شریک تھے یہ ذکر آیا کہ حضرت عمر کے وظیفے میں اضافہ کرنا چاہیے

کہ گذر میں تنگی ہوتی ہے۔ مگر ان سے عرض کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لیے ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ جو حضورؐ کی بیوی ہونے کی وجہ سے ام المومنین بھی تھیں اُن کی خدمت میں یہ حضرات تشریف لے گئے اور ان کے ذریعے سے حضرت عمرؓ کی اجازت اور رائے معلوم کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہم لوگوں کے نام معلوم نہ ہوں۔

حضرت حفصہؓ نے جب حضرت عمر سے اس کا تذکرہ کیا تو چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضرت عمر نے نام دریافت کیے۔ حضرت حفصہ نے عرض کیا کہ پہلے آپ کی رائے معلوم ہو جائے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ ”مجھے ان کے نام معلوم ہو جاتے تو ان کے چہرے بدل دیتا یعنی ایسی سخت سزائیں دیتا کہ منہ پرنشان پڑ جاتے، تُو ہی بتا کہ حضورؐ کا عمدہ سے عمدہ لباس تیرے گھر میں کیا تھا۔ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ دو کپڑے گیروے رنگ کے جن کو حضورؐ جمعے کے دن یا کسی وفد کی آمد پر پہنتے تھے۔ پھر کہا کہ کون سا کھانا تیرے یہاں عمدہ سے عمدہ حضورؐ نے کھایا۔ حضرت حفصہؓ نے فرمایا کہ ہمارا کھانا جَو کی روٹی تھی، ہم نے گرم گرم روٹی پر گھی کے ڈبے کی تلچھٹ اُلٹ کر اُس کو ایک مرتبہ چپڑ دیا تو حضورؐ خود بھی اُسے مزے لے کر نوش فرما رہے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ حضرت عمر نے پوچھا، کون سا عمدہ بچھونا ہوتا تھا جو تیرے یہاں بچھاتے تھے۔ حضرت حفصہ نے فرمایا کہ ایک موٹا سا کپڑا تھا، گرمی میں اس کو دوھرا کر کے بچھا لیتے تھے اور سردی میں آدھے کو بچھا لیتے اور آدھے کو اوڑھ لیتے۔

حضرت عمر نے فرمایا کہ حفصہ! ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے کہ حضورؐ نے اپنے طرز عمل سے ایک اندازہ مقرر فرما دیا اور اُمید (آخرت) پر کفایت فرمائی۔ میں بھی حضور کا اتباع کروں گا۔ میری مثال اور میرے دو ساتھیوں۔حضورؐ اور ابوبکر صدیق۔کی مثال ان تین شخصوں کی سی ہے جو ایک راستے پر چلے۔ پہلا شخص ایک توشہ لے کر چلا اور مقصد کو پہنچ گیا، دوسرے نے بھی پہلے کا اتباع کیا اور اسی کے طریقے پر چلا، وہ بھی پہلے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر تیسرے شخص نے چلنا شروع کیا۔ اگر وہ ان دونوں کے طریقے پر چلے گا تو ان کے ساتھ

مل جائے گا اور اگر ان کے طریقے کے خلاف چلے گا تو کبھی بھی ان سے نہیں مل سکے گا۔ (اشہر)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کھانا نوش فرما رہے تھے۔ غلام نے آکر عرض کیا کہ عتبہ بن ابی فرقد حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے اندر آنے کی اجازت دی اور کھانے کی دعوت دی وہ شریک ہوگئے تو ایسا موٹا کھانا تھا کہ نگلا نہ گیا۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ چھنے ہوئے آٹے کا کھانا بھی تو ہو سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا سب مسلمان میدہ کھا سکتے ہیں؟ عرض کیا، سب تو نہیں کھا سکتے۔ فرمایا، افسوس! تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی ساری لذتیں دنیا ہی میں ختم کر دوں۔ (اسدالغابہ)

حضرت عثمانؓ

ابن سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں میں نے حضرت عثمان کو دیکھا کہ دوپہر کو مسجد نبوی کے صحن میں کچی اینٹ بطور تکیے کے سر کے نیچے رکھ کر لیٹے ہوئے ہیں۔ میں گھر گیا تو والد سے دریافت کیا یہ کون حسین و جمیل شخص تھا جو اس حالت میں مسجد میں لیٹا ہوا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عثمان ہیں۔ (ابن کثیر جلد ۷)

ابوالفرات راوی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان کسی معاملے میں اپنے غلام پر خفا ہوگئے اور غصے میں آکر اس کا کان پکڑ کر مروڑ دیا۔ پھر جس وقت چھوڑ دیا تو غلام سے کہا، میں نے تم پر زیادتی کی ہے کہ تمھارا کان مروڑ ڈالا، تم بھی میرا کان پکڑ کر مروڑو تاکہ بدلہ پورا ہو جائے۔ غلام نے کچھ جھجک محسوس کی تو اصرار کیا کہ میرا کان ضرور مروڑو۔ غلام نے کان پکڑا اور معمولی سا مروڑا۔ فرمایا اس طرح نہ کرو، خوب زور سے مروڑو اور فرمایا ''وہ بدلہ بہت ہی اچھا ہے جو دنیا ہی میں لیا جائے اور آخرت میں اس کی سزا نہ بھگتنی پڑے۔''
(اشہر مشاہیر الاسلام جلد ۴ صفحہ ۹۴۷)

حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسلامی قلمرو کے گورنروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں لکھا:

''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے امیروں کو یہ حکم دیا ہے
کہ وہ اپنے آپ کو قوم کے نگہبان اور چرواہے سمجھیں۔

ان کو اس لیے مسندِ خلافت و امارت پر سرفراز نہیں کیا گیا
کہ وہ قوم کو ٹیکسوں کے بوجھ سے دبا ڈالیں ۔"

ایک مرتبہ جمعے کی نماز کے لیے تشریف لانے میں دیر ہوئی تو تشریف لا کر معذرت فرمائی کہ مجھے اپنے کپڑے دھونے میں دیر ہوئی اور ان کپڑوں کے علاوہ اور تھے نہیں ۔ (اشہر)

حضرت علی رضؓ

عبداللہ بن ہذیل کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کو ان کے زمانۂ خلافت میں دیکھا ، ان کے بدن پر موٹا کُرتا تھا جو بوسیدہ ہو چکا تھا ۔

ابن عبداللہ بن ہذیل سے روایت ہے کہ حضرت علی رضؓ کوفے کی مسجد میں تشریف فرما تھے ، وہ موٹی چادریں پہنے ہوئے تھے اور تقویٰ کی تلقین کر رہے تھے ۔

حضرت علی کے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ بیت المال میں بہت بڑی مقدار میں سونا چاندی آیا جس سے بیت المال بھر گیا ۔ آپ نے وہ سارا مال غربا اور مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا ۔ جب کچھ نہ رہا تو اس جگہ پر جہاں سونے چاندی کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے جھاڑو دلوا کر دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا ، میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ یہ زمین اس بات کی شہادت دے کہ میں نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں رکھا ، سب غربا میں تقسیم کر ڈالا ہے ۔ ایک روایت میں ہے ، فرمایا ، لوگو ! میں نے تمہارے لیے مال فئے میں سے کچھ نہیں لیا ۔ صرف ایک شیشی لی ہے جو میرے آزاد کردہ غلام دہقان کے حصے میں آئی تھی ۔
(حیات ابی طالب)

کُمیل سے روایت ہے کہ میں حضرت علی رضؓ کے ساتھ ایک مرتبہ جا رہا تھا ۔ وہ جنگل میں پہنچے ، پھر ایک مقبرے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ، اے مقبرے والو! اے بوسیدگی والو ! اے وحشت اور تنہائی والو ! کیا حال ہے ؟ پھر ارشاد فرمایا کہ ہماری خبر تو یہ ہے کہ تمہارے بعد اموال تقسیم ہوگئے ، اولادیں یتیم ہوگئیں ، بیویوں نے دوسرے خاوند کر لیے ۔ یہ تو ہماری خبر ہے ، کچھ اپنی تو کہو ۔ اس کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کُمیل ! اگر ان لوگوں کو بولنے کی اجازت ہوتی اور یہ بول سکتے تو جواب میں یہ کہتے کہ بہترین توشہ تقویٰ ہے ۔

یہ فرمایا اور پھر رونے لگے اور فرمایا اے کمیل ! قبر عمل کا صندوق ہے اور موت کے وقت اصل بات معلوم ہو جاتی ہے ۔ (منتخب کنز)

حضرت ابو ذر غفاریؓ

جب حضرت ابو ذر غفاری مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت سعد بن ابی وقاص ان کی عیادت کو آئے ۔ حضرت ابوذر انہیں دیکھ کر رونے لگے ۔ اُنہوں نے کہا رونے کی کوئی وجہ نہیں ، رحمۃ اللعٰلمین آپ سے بہت خوش تشریف لے گئے ۔ آپ، قیامت کو اپنے احباب و رفقا سے ملیں گے اور انشاء اللہ حوض کوثر پر آقائے نامدار صلعم فداہ ابی و امی سے بھی ملاقات ہوگی ۔ آپ نے فرمایا ، بخدا میں موت کی تلخی سے یا دنیا کے طمع سے نہیں ڈر رہا لیکن رسول خدا صلعم کا وہ فرمان یاد آرہا ہے جس میں آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ تمھاری معاش ایک مسافر کی ذادِ راہ سے زیادہ نہ ہو ، حالانکہ ہمارے آس پاس یہ سانپ ہیں ۔ جس سامان کو آپ نے سانپ کا خطاب دیا تھا وہ صرف ایک پیالہ ، ایک کمبل اور ایک لوٹے کے سوا کچھ نہ تھا ۔

جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو بیوی سے کہا کہ وہ مشک کی تھیلی جو میں نے سنبھال رکھی تھی اُٹھا لاؤ ۔ وہ اُٹھا لائیں تو آپ نے پیالے میں پانی منگوا کر مشک کو اس میں حل کر دیا اور اپنے ارد گرد چھڑکوایا ۔ پھر فرمایا تم یہاں سے چلی جاؤ اس لیے کہ میرے پاس ایک ایسی مخلوق آنے والی ہے جو خوشبو کو پسند کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی بیوی نے ایک نہایت ہلکی آواز سنی، جا کر دیکھا تو وصال ہو چکا تھا ۔

حضرت حمزہؓ کا کفن

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوگئے اور بیدرد کافروں نے آپ کے کان ناک وغیرہ اعضاء کاٹ دیے اور سینہ چیر کر دل نکالا اور طرح طرح کے ظلم کیے ۔ لڑائی ختم ہونے پر حضور اکرم اور دوسرے صحابہ شہیدوں کی نعشیں تلاش فرما کر ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام فرما رہے تھے کہ حضرت حمزہؓ کو اس حالت میں دیکھا ۔ نہایت صدمہ ہؤا ۔ ایک چادر سے ان کو ڈھانپ دیا ۔ اتنے میں حضرت حمزہؓ کی حقیقی بہن حضرت صفیہ تشریف لائیں کہ اپنے بھائی کی حالت کو دیکھیں ۔ حضورؐ نے اس خیال سے کہ آخر عورت

میں ایسے ظلموں کو دیکھنے کا تحمل مشکل ہوگا ان کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ سے ارشاد فرمایا کہ اپنی والدہ کو دیکھنے سے منع کر دو۔

اُنھوں نے والدہ سے عرض کیا کہ حضورؐ نے دیکھنے سے منع فرما دیا ہے۔ صفیہؓ نے کہا کہ میں نے یہ سنا ہے کہ میرے بھائی کے ناک کان وغیرہ کاٹ دیے گئے۔ اللہ کے راستے میں یہ کونسی بڑی بات ہے۔ ہم اس پر راضی ہیں۔ میں اللہ سے ثواب کی اُمید رکھتی ہوں اور انشاء اللہ صبر کروں گی۔ حضرت زبیرؓ نے حضورؐ سے جا کر اس کلام کا ذکر کیا تو حضور نے اس جواب کو سن کر دیکھنے کی اجازت دے دی۔ آ کر دیکھا، انا للہ پڑھی اور ان کے لیے استغفار اور دعا کی۔

ایک روایت میں ہے کہ غزوہ اُحد میں جہاں نعشیں رکھی ہوئی تھیں ایک عورت تیزی سے آ رہی تھی۔ حضور نے فرمایا، دیکھو! اس عورت کو روکو۔ حضرت زبیرؓ کہتے ہیں میں نے پہنچان لیا کہ میری والدہ ہیں۔ میں جلدی سے روکنے کے لیے بڑھا۔ مگر وہ قوی تھیں، ایک گھونسا میرے مارا اور کہا پرے ہٹ۔ میں نے کہا کہ حضورؐ نے منع فرمایا ہے تو فوراً کھڑی ہوگئیں۔ اس کے بعد دو کپڑے نکالے اور فرمایا کہ میں اپنے بھائی کے کفن کے لیے لائی تھی۔ میں ان کے انتقال کی خبر سن چکی ہوں، ان کپڑوں میں ان کو کفنا دینا۔ ہم لوگ وہ کپڑے لے کر حضرت حمزہؓ کو کفنانے لگے کہ برابر میں ایک انصاری شہید پڑے ہوئے تھے جن کا نام حضرت سہیلؓ تھا۔ اُن کا بھی کفار نے یہی حال کر رکھا تھا جیسا حضرت حمزہ کا تھا۔ ہمیں اس بات سے شرم آئی کہ حضرت حمزہ کو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے اور انصاری کے پاس ایک بھی نہ ہو۔ اس لیے ہم نے دونوں کے لیے ایک ایک کپڑا تجویز کیا۔ ایک کپڑا ان میں سے بڑا تھا اور دوسرا چھوٹا۔ ہم نے قرعہ ڈالا کہ جس کے حصے میں جو کپڑا جن کے حصے میں آ جائے گا وہ ان کے کفن میں لگا جائے۔ قرعے میں بڑا کپڑا حضرت سہیل کے حصے میں آیا اور چھوٹا حضرت حمزہ کے حصے میں آیا جو ان کے قد سے بھی کم تھا۔ اگر سر کو ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کی طرف کیا جاتا تو سر کھل جاتا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ سر کو کپڑے سے ڈھک دو اور پاؤں پر پتے وغیرہ ڈال دو۔ (خمیس)

شاہ ولی اللہ اور اسلامی سوشلزم

محمد سرور

انسانیت کی تباہی اور زبوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا، وہ فاقے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح انھیں محتاج رکھ کر ان کو معاشی اور اخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے۔ معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ کی فکر میں کسی اور چیز کی سدھ بدھ نہیں رہتی اور انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں وہ سب بہم نہیں پہنچتیں اور اس طرح انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی اسباب و حالات سے متاثر ہوتے ہیں اس لحاظ سے اشتراکیت کے معاشی اصولوں سے اختلاف کرنا بڑا مشکل ہے لیکن بحیثیت مسلمان کے ہمارا کہنا ہے کہ بے شک انسان کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رخ کو بھی جو اخلاق اور فکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی تمدن پائدار نہیں ہوتا چنانچہ سرمایہ‌داروں پر جہاں یہ الزام ہے کہ انھوں نے انسانیت کے بہت بڑے حصے کو محتاج رکھ کر انھیں انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا۔ ان پر دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ اس بڑے حصے میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انسانی اخلاق اور فکر کو اپنی صلاحیتوں سے بڑی ترقی بخش سکتا تھا لیکن سرمایہ داروں نے اسے روٹی کا محتاج کر کے اس سے محروم کر دیا چنانچہ ان کی وجہ سے انسانیت کی ترقی مجموعی طور پر رک گئی۔

جب کسی وجہ سے قوم کا ذہین طبقہ جو اخلاق اور افکار کا مالک ہوتا ہے اپنے فرض منصبی سے غفلت برتتا ہے تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ ان کی ذلت کا پہلا قدم تملق ہے یعنی حکمراں طبقے کی خوشامد کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے

کی کوشش اور یہی مرض ہے جو آگے چل کر ان کو غیر اللہ کی عبادت کا داعی بنا دیتا ہے۔ یہی جذبہ بت پرستی سکھاتا ہے اور اس منزل میں انسانیت کے اعلیٰ خصائل سارے تباہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کے برباد کرنے کے لیے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں پھر اس برباد شدہ انسانیت کے کھنڈرات پر صالح انسانوں کی آبادی بستی ہے۔

اس زوال آمادہ اور فرسودہ کی تباہی تمدن کے لیے انسانوں کا ایک نیا گروہ اُٹھتا ہے۔ قدرتی اسباب ان کے موید ہوتے ہیں، اس گروہ کی قیادت ایک شخص کو ملتی ہے جو انقلاب کا امام ہوتا ہے۔

ان آئمہ انقلاب کا ایک اونچا درجہ ہے جنھیں انبیاء کا نام دیا جاتا ہے۔ انبیا کے لائے ہوئے نظام میں انسانی فطرت کو زیادہ رعایت ہوتی ہے اس لیے یہ نظام دیر تک قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جس قدر قصے ہیں وہ اسی انقلاب کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو رسول اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ رسول اللہؐ انسانیت کے عالمگیر انقلاب کے داعی تھے۔ آپ کے اصحاب خلافت راشدہ کے دور میں اس کو ایک درجہ تک عالم گیر بنا دیتے ہیں یعنی اس انقلابی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری رجعت پسند حکومتیں جمع ہو کر بھی اس انقلابی حکومت کے مقابلے میں نہیں ٹھیر سکتیں۔ قرآن کا یہ انقلاب ختم نہیں ہؤا بلکہ یہ ہمیشہ برسرپیکار رہے گا کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا جس میں رجعت پسندی کی طاقتیں بالکل معدوم ہو جائیں۔ اگر اقدام پسندی اور رجعت پسندی کی یہ کشمکش نہ رہے تو پھر انسانیت کا بھی خاتمہ ہے۔

شاہ ولی‌اللہ صاحب کی کتابوں میں ان نظریات کا بار بار ذکر ہے اور آپ نے اپنے زمانے کی گری ہوئی سوسائٹی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ قوم کی نجات اس فرسودہ نظام کو توڑے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ حجتہ‌اللہ البالغہ کی دوسری جلد صفحہ ۱۰۵ میں فرماتے ہیں:

"دس ہزار آدمیوں کی ایک بستی ہے اگر اس کا اکثر حصہ نئی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف نہیں رہتا تو وہ ہلاک ہو جائے گی۔ ایسے ہی اگر ان کا بڑا حصہ تعیش میں مبتلا ہو گیا تو

وہ قوم کے لیے بار بن جائے گا۔ جس کا ضرر بتدریج ساری آبادی میں پھیل جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی جیسے انھیں دیوانے کتے نے کاٹ کھایا ہو“۔

اسی کتاب کی پہلی جلد میں صفحہ ۳۵ پر مذکور ہے :

”اس زمانے میں اکثر بلاد کی بربادی کا بڑا سبب دو چیزیں ہیں ، ایک تو سرکاری خزانے سے بناوٹی حقوق کا نام لیکر لوگ روپیہ وصول کرتے ہیں ۔ جس نام سے وہ روپیہ لیتے ہیں اس کے حق کو وہ کسی طرح پورا نہیں کرتے ۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کمانے والی جاعتوں یعنی کاشتکار ، تاجر اور پیشہ وروں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں ۔ ان میں سے نرم مزاج تو ٹیکس ادا کر رہے ہیں لیکن جن میں مقابلے کی ہمت ہے وہ بغاوت اختیار کرتے ہیں ۔ اسی طرح ساری سلطنت کمزور ہو جاتی ہے ۔“

شاہ ولی‌اللہ صاحب کی تعلیمات میں معاشی مسئلے کی اہمیت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اگر انسانوں کی معاشی حالت درست نہ ہو تو نہ ان کے اخلاق اچھے ہونگے اور نہ ان کی انسانیت صالح ہو سکے گی ۔ آپ نے دہلی کے محمد شاہی دور کو قیصر و کسریٰ کا مماثل ٹھیرایا ہے یعنی تعیش ، اسراف ، سرمایہ داری اور لوٹ کھسوٹ خواہ کافروں کے ہاتھ سے ہو یا نام کے مسلمانوں کے ہاتھ سے دونوں مٹائے جانے کے قابل ہیں اور مٹانے کا یہ کام صرف انقلاب کرتا ہے ۔ یہ انقلاب برپا کرنا اسلام کا مقصد اعلیٰ ہے اور اس کو آج عملی شکل میں پیش کرنا مسلمانوں کا فرض ۔

شاہ صاحب کے نزدیک رسول اکرم علیہ‌الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کے ذریعے خدا کے دین کو باقی سب دینوں پر غالب کر دیا جائے اور اسلام انسانوں کو ایک ایسا نظامِ حیات دے جو سب نظاموں سے بہتر اور اعلیٰ ہو ، آپ کی بعثت کا یہ مقصد اس صورت میں پورا ہؤا کہ قیصر و کسریٰ کا نظام جو ایک حد تک ساری دنیا پر حاوی تھا پاش پاش ہو گیا اور انسانیت کو قیصریت اور کسرویت دونوں سے نجات ملی ۔

قیصر و کسریٰ کے نظام کو تباہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی

کہ اس کی بنا مفاد عامہ کے خلاف جمہور کی لوٹ کھسوٹ Exploitation پر تھی ۔ بادشاہ اس کے امیروں اور مذہبی طبقوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ رعیت کی خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت سے عیش کریں ۔ حجتہ‌اللہ کے صفحہ ۱۰۵ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ

”عجم اور روم کے شہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمربند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا ۔“

لوٹ کھسوٹ کی اس گرم بازاری میں عوام کی حالت حیوانوں سے بد تر ہو گئی تھی اور پھر اوپر کے طبقوں کو جب بغیر مشقت کے ثروت ملے تو اس میں ہر قسم کے اخلاقی عیوب پیدا ہو جاتے ہیں ۔ نہ ان کی صحتیں ٹھیک رہتی ہیں اور نہ ذہنی قوائے اور چونکہ ان کی زندگی کا مقصد محض رندی و ہوسناکی بن جاتا ہے ۔ اس لیے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور شاہی دربار سازشوں کا مرکز ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ اس طرح عوام تو بھوک سے بے جان ہو گئے اور ”اشراف“ کو ثروت نے بیکار کر دیا ۔ کلیلہ دمنہ کے مصنف ایرانی حکیم برزویہ نے اس وقت ایران کی جو حالت تھی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مضر ہے ۔ جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے ۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے ۔ علم پستی کے درجے میں ہے اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے ۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافت نفسی پامال ہے ۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے ۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے ۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون کو توڑنا ہے ۔ مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے ۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے ۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشہ میں

یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا
کر دیا ہے۔"

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی - شاہ صاحب کے الفاظ میں انکا یہ روگ بڑھتا ہی چلا گیا - آخر یہ ہؤا کہ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کی آتشِ غضب بھڑکی اور نبیٔ امی (صلعم) مبعث ہوئے جن کی زبان سے قیصر و کسریٰ کی عادات کی مذمت فرمائی گئی اور ان کے ذریعے دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا ــ اور ان کی جگہ ایک اور نظام نافذ ہؤا جو عدل و مساوات پر مبنی تھا چنانچہ اوپر کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے یا تو سرے سے ناپید ہو گئے یا ان کے ہاتھوں سے اقدار چھن گیا قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک کے عوام کو سر اٹھانے کا موقعہ ملا اور اس واقعہ پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مصر ، شام ، افریقہ اور ایران میں وہاں کے عوام جماعتی زندگی میں پیش پیش نظر آنے لگے -

قیصریت اور کسرویت کی عادات کی مذمت ان کے نظام کی تخریب اور ایک صالح اور مفید نظام کا نفاذ قرآن کی تنزیل کا مقصد تھا- جو گروہ اور قوم قیصریت کو اپنا شعار بنانے اور عوام کی لوٹ کھسوٹ پر ان کی گزاران ہو قرآن ان کے خلاف دعوت جہاد دیتا ہے- قرآن کا یہ پیغام کسی جماعت یا کسی قوم کے لیے مخصوص نہیں ، قرآن ہر ظلم کا انکار کرتا ہے - ہر مظلوم کے دل میں یہ ولولہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ظلم کو مٹانے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور اس کے اصرار پر اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو - خود مکہ کی زندگی میں چند بنیادی خامیاں تھیں جن کی بنا پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی - مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی- مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا اور خود رسول اللہ (صلعم) کے چچا حضرت عباس تک اسلام لانے سے پہلے سود کا بڑے پیمانے پر کام کرتے تھے - یہ امیر طبقہ مال مست تھا - تجارت اور سرمایہ سے انہیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لیے حبشی غلام خریدتے اور خط نفس کے لیے لونڈیاں لاتے چنانچہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں ، شراب

کا دور چلتا ، سفر کے سلسلہ میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام میں گزر ہوتا تو وہاں سے یہ عیش و عشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے۔ مکہ کا یہ گنتی کا اوپر کا طبقہ اس لہو ولعب میں منہمک تھا لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی -

دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت پڑی اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطۂ نظر متعین کرنا لازمی ہے وہ انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان جن میں اکثر کش مکش رہتی ہے - صلح و صفائی اور میل ملاپ کی راہ پیدا کرنا ہے - امیر و غریب کا فرق آسودہ حال و قلاش کی چپقلش ، زمینداروں اور کسانوں کا تفاوت ۔ زر داروں اور بے زرداروں کی آپس میں کھینچا تانی ، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی بے اعتمادی ، اس کشمکش ، اس اختلاف ، اس دشمنی کو جو ایک قوم کے مختلف طبقوں میں قدرتاً ہوتی ہے دور کرنا ہر صاحب مذہب اورہر نئے نظام کا فرض ہوتا ہے- اس لحاظ سے اسلام کو بھی اس مسئلے کا حل کرنا ضروری تھا چنانچہ مذہب اسلام اعلانِ جنگ تھا ظالم ، تاجر ، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کے خلاف جو پسماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہمات پرستی سے فائدہ اُٹھاتے تھے - مکے کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ رنگ اور نسب کے عجیب و غریب تصورات بنا رکھے تھے - یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعے سے روا رکھی جاتی تھی - مذہب ہو یا سیاست ، تجارت ہو یا اجتماع ، ان سب کا حاصل یہ ہو گیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اور فروغ ملے -

اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسے پایا تھا اور اس کی کایا کیونکر پلٹ دی ؛ اسلام کے اس زریں کارنامے کی صدائے بازگشت دوسروں کی زبان سے سنیے ، ایم این رائے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

” اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی جس نے عرب کے قبائل کو متحد کر دیا - کچھ ہی عرصے کے بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنت روما کے وہ تمام ایشیائی و افریقی صوبے آ گئے جو مدتہا سنزلزل نسم سے

نکلنا چاہتے تھے ۔ عیسائیت میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی ۔ وہ اپنے کمزور کندھوں پر خانقاہیت کا پشتارہ لیے کانپ رہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں عربستان سے امید کی کرن پھوٹی ۔ اسلام کی تلوار بظاہر خدا کی خدمت کے لیے بلند ہوئی لیکن درحقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگِ بنیاد رکھا جس نے تمام فرسودہ خیالی ، توہم پرستی اور قدیم مذاہب کو موت کو گہری نیند سلا دیا ''۔

اسلام کی اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کا مشہور مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے :

''اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے اور اس زمانے کی عربی تہذیب کے اثر اور اس کی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی۔ ایرانی ، باز نطینی اور قبطی سب ایک لا علاج کاہلی کا شکار ہو رہے تھے اور اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں ۔ عربوں سے ربط و ضبط پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی سستی دور ہو گئی اور ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہو گئی ''۔

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زیادہ زور دیا یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اُچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی لیکن اسلامی انقلاب سے جو شاندار اور دور رس نتائج برآمد ہوئے ان کی تحقیق نہ کی ۔ اموی تلواریں مشرق میں پاکستان ، ہندستان ، افغانستان ، ترکستان ، خراسان اور ایران اور ادھر مغرب میں فرانس کی حدود تک عربی نفوذ اور اقتدار کے لیے راستہ صاف نہ کرتیں تو ان ممالک ہیں اسلام کو کیسے بار ملتا ، سچ پوچھیے تو ان فتوحات کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہو سکے کہ پسماندہ زندگی سے متمتع ہونے کا موقع ملا ۔

اس وقت دول فارس و روما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی تاکہ ایک سماجی نظام نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لیکر اُٹھے اور تیرہ و تار دنیا میں علم کا نور پھیلا دے ۔ مجوسی تصوف کے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور بازنطینی ممالک کے عوام کو

ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعر مذلت میں پھینک دیا تھا۔ بنوامیہ کی عربی حکومت نے دول روما کے کھنڈروں کو صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور دوسرے اپنی فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو بھی عام کیا۔ اس طرح مفتوحہ قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں اور ان کا اثر یہ ہؤا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہو گئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ موسیو لیبان کے الفاظ میں:

> " خوں ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں بویا گیا تھا از سرنو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکبِ اقبال کی درخشانی سے افق روشن ہو جاتا ہے یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت و جلال کے ایک شاندار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔ "

چٹان لاہور، (۱۲ ستمبر ۹۶۶ء)

حکیم آزاد شیرازی

ہفت روزہ چٹان (۱۲ ستمبر) میں جناب محمد سرور کا مقالہ ان سطور کا محرک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کارل مارکس کی پیدائش سے نصف صدی پیشتر برصغیر کے عظیم اسلامی فلسفی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس حقیقت کا انکشاف کر دیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اقتصادی عدم توازن کو ختم کر کے دنیا کی روحانی اصلاح فرمائی۔ حضرت شاہ صاحب نے واضح الفاظ میں بتایا کہ سیاستدانوں، خانقاہ نشینوں اور درباری شاعروں کا تن آسان خوشامدی طبقہ اس سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس نظام کو ختم کرنے کے لیے اسلام آیا ــ انھوں نے بتایا کہ جس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایے کا بھوت سوار ہو وہ حیوانی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

آج مغرب کے سرمایہ دارانہ کلیسائی نظام کی چکی میں پسنے والی انسانیت صرف اس لیے اپنے ان تمام معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کی تلاش

کارل مارکس اور لینن کے فلسفے میں کر رہی ہے کہ کارل مارکس اور لینن کا فلسفہ عملی طور پر ایشیا کے دو عظیم خطہ ہائے ارضی میں نافذ ہے اور اسلام کے نام نہاد علمبردار حقیقی اسلام کو سرمایہ پرستی کے پردوں میں چھپا کر نہ تو اس کی جھلک دنیا کو دکھاتے ہیں اور نہ حقیقی اسلام دنیا کے کسی خطے میں عملی طور پر نافذ ہے — ورنہ دنیا اشتراکیت اور سوشلزم کے نامکمل نظام حیات میں پناہ لینے اور امن و سکون تلاش کرنے کی کوشش ہرگز نہ کرے بلکہ اسلام کے مکمل نظام حیات ہی میں اُس فردوس گوش اور جنت نگاہ منظر کی طرف لپک کر دوڑے جس کے صرف ایک جز پر عمل کر کے چین آج ایشیا کا ایک عظیم ملک بن چکا ہے۔

سید نا شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی مشہور کتاب حجتہ اللہ البالغہ کے ایک صفحے کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے — اور اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا کارل مارکس کی پیدائش سے نصف صدی پہلے ان خیالات کا اظہار کرنے والا اسلام کا یہ عظیم فلسفی بھی ''کمیونسٹ'' تھا —؟

حضرت شاہ صاحب اس ماحول کی وضاحت کرتے ہوئے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور قدسی ہؤا تھا ایران اور روما کی سرمایہ دار شہنشاہیوں کا تذکرہ فرماتے ہیں جن کی حالت یہ تھی کہ ''دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا، نئی نئی صنعتیں رونما ہوئیں اور ملک اپنے اس دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا لیکن بد قسمتی سے اہل ثروت اور حکمران طبقے میں عیش، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پسندی اور ایک دوسرے کے مقابلے میں تفاخر کا مرض پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس بات پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے سریر سلطنت میں زیادہ جواہر ٹکے ہوئے ہیں؟ ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ نے معاشرے کا مزاج بگاڑ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شوکت اور شاہانہ تکلفات نباہنے کے لیے ہر صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار کاشتکار کا خون چوسنے لگے اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے وہ غریب مزدوروں کو نوچنے لگے۔ اب اس بااقتدار طبقے کی تمام عملی اور فکری قوتیں ملک و سلطنت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات نفع اندوزی اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں اور ماتحت

طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں اور گھوڑوں کے مانند ہو گئی۔ زرکشی اور زراندوزی کے لیے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔ مزدور اور کسان طبقہ اگر ان سے سرتابی کرتا تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا۔ یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائش انسانی کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے نہ رہا۔ ایک طبقے کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہؤا کہ فکرِ مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہو گئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

''اقتصادی عدم توازن اور طبقۂ اعلیٰ کی شان‌وشوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا۔ ان میں بہت سے صاحب فن اور اہل علم بھی تھے۔ وہ فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے۔ ان کا مطمح نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ اپنی ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار ان کی جد و جہد کا نصب العین ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فنِ سپہ گری کا ماہر ہے اور بہترین جرنیل اور کمانڈر ہے۔ کوئی اپنے علم‌وہنر یا سیاستدانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی۔ ایک گروہ فنون لطیفہ، ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتا تھا کہ شانِ خسروانہ یہی ہے کہ بادشاہ فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

'' بادشاہ یا امراء کو خوش گپیوں سے مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے۔ شاہانہ آداب درباری آداب بن گئے تھے اور ایک گروہ اسی نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدن مان لیا گیا تھا در حقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی

خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور ان کی خوشنودی کے لیے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے ۔

" اس طرح خدا کی تمام مخلوق روز بروز افلاس، ہلاکت، تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی یہاں تک کہ پورے ملک میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ملتا تھا جس کو عاقبت کی فکر ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے (جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو مبعوث فرمایا تا کہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اصولوں کی تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے ۔ "

حضرت شاہ ولی اللہ نے روحانی اقدار پر اقتصادی حالات کے اثرات بیان کرنے کے لیے ایک مثال پیش فرمائی ہے ۔ اس مثال سے حضرت شاہ صاحب کی تصوراتی مملکت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو ، شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو ، ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دہری نہ ہوتی ہو ۔ ایسی قوم ہی کو یہ فراغت میسر ہوگی کہ وہ دین و ملت کے کام انجام دے سکے ۔ اخلاقی اور روحانی ترقی حاصل کر سکے لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت ، شاہ پرستی اور سرمایے کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپایوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گی جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھر نہیں پاتا ــ " (حجتہ اللہ البالغہ ، جلد اول ، باب اقامت)

ان سطور کے مطالعے کے بعد سرمایہ‌دارانہ نظام کے "مذہبی محافظوں" اور مفتیان کرام کا حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ کے بارے میں کیا فتویٰ ہے ؟

چیست یارانِ طریقت بعد ازین تدبیر ما

چٹان لاہور ، ۱۹ ستمبر ۶۶ء

* * *

شیخ افتخار احمد

اسلام

سرمایہ‌داری یا سوشلزم ؟

زیر بحث موضوع پر یہاں تاریخی لحاظ سے بحث کی گئی ہے ، کیونکہ اسلام کا ظہور تاریخ کے اجالالے میں ہؤا ہے ۔

زیر بحث موضوع کے بہت سے رخ ہیں ، لیکن یہاں اسلام کے حوالے سے صرف سرمایہ داری اور سوشلزم سے بحث کی جائے گی ، کیونکہ کوئی تیسرا اقتصادی نظام اس وقت اس حیثیت سے موجود نہیں کہ ان کا حریف ہو سکے ۔

اس بحث کی محض علمی اہمیت ہی نہیں ، کیونکہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی مملکتوں میں رہ رہی ہے جہاں سوشلسٹ اقتصادی نظام رائج ہے ، خواہ وہ وہاں زبردستی ٹھونسا گیا ہو ، یا برضا و رغبت اختیار کیا گیا ہو ۔ اور وہ مسلمان جو خود اپنی سرمایہ دارانہ نظام کی حامل مملکتوں میں رہتے ہیں ، ان کے متعلق ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس نظام کو قبول کرکے اس پر جم گئے ہیں ؛ یہ مملکتیں صحیح معنی میں سرمایہ دار مملکتیں نہیں ہیں ۔

سرمایہ داری مغربی عیسائیت کے مترادف ہے ۔ اگرچہ عیسائیت نے سرمایہ داری کو پیدا نہیں کیا ، لیکن سائنس کو ، جس پر سرمایہ داری کی بنیاد ہے ، دبانے کی طویل ، سخت اور ناکام کوشش کرنے کے بعد عیسائیت نے سرمایہ داری سے محکومانہ اتحاد قائم کر لیا ہے کیونکہ اس کے سوا عیسائیت کے بقا کی کوئی اور صورت نہ تھی ۔

دوسرے مذاہب یعنی یہودیت ، ہندو مت اور بدھ مت اپنی نامنلنساری ، خانقاہیت ، اور ذات پات کے نامعقول نظام کی وجہ سے ، جو ہندو مت سے مخصوص ہے ، سرمایہ داری کا دم بھرنے پر مجبور ہیں ۔ دنیا کے بڑے مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی راہ آپ چن سکنے کے قابل ہے ۔ اور آسے یہ چناؤ ابھی کرنا ہے کیونکہ

اسلامی ملکوں کی اکثریت نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے اور حصول آزادی کے بعد بھی یہ ملک اسی سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام پر کار بند چلے آ رہے ہیں ، جو اُنہیں استعمار پسند قوتوں سے ورثے میں ملا ، کیونکہ وقتی طور پر اس سے بہتر کوئی نظام ان کے پیشِ نظر نہ تھا ۔

زیر بحث مسئلے کا آخری پہلو ، جو اہمیت میں آخری نہیں ہے ، یہ ہے کہ کیا کسی سیاسی/اقتصادی نظام کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی بنیاد مذہب پر ہو ، یا وہ مذہب کی طرف میلان رکھے ؟ اس کے جواب کے لیے بعض حقائق کے پس منظر کی ضرورت ہے اور جب یہ حقائق سامنے آ جائیں گے تو امید ہے کہ خود ہی جواب مہیا کر دیں گے ۔

سرمایہ داری

سرمایہ داری ایک ایسا اقتصادی نظام ہے جس میں اجتماعی پیداوار کے لیے مزدوری اور محنت کو کام میں لایا جاتا ہے ۔ اجتماعی پیداوار مشینوں کے ذریعے سے ممکن ہوئی ، جو مغرب میں کلیسا اور سائنس کے مابین ایک طویل کشمکش کے بعد ، وجود میں آئیں ۔ اس کشمکش میں کلیسا کے پاس اپنی بات پر اڑے رہنے اور اُسے سنوانے پر زور دینے کے لیے کوئی اخلاقی وجوہ نہ نہیں بلکہ کلیسا کی مخالفت اس لیے تھی کہ بیشتر سائنسی نظریے بائبل سے متصادم ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں ۔ آخر کار کلیسا اور مملکت میں افتراق پیدا ہو گیا ۔

ساقی کہاں اس فقیری میں میری !

جی ۔ جے ۔ ہولی اوک (۱۸۱۷—۱۹۰۶) نے اس نئے لادینی نظام کی تعریف یوں کی ہے :

> لادینیت ایک ایسا نظام ہے جو انسان کے جسمانی ، اخلاقی اور ذہنی قویٰ کی اعلیٰ ترین نشو و نما کا ، زندگی کے فوری فرض کے طور پر ، خواہاں ہے اور دہریت ، خدا پرستی اور بائبل سے الگ ہو کر فطری اخلاق کی عملی خود مختاری کو بروئے کار لاتا ہے اور اپنے طریقۂ کار کے طور پر مادی ذرائع سے انسانی اصلاح کے فروغ کا راستہ اختیار کرتا ہے ۔

یہ دو باتیں یعنی اقلیت کی طرف سے جلبِ منفعت اور اُس کے ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز ، جسے وہ مزید جلبِ منفعت کے لیے استعمال کر سکتی

تھی، عام بغاوتوں کا باعث بن گئیں۔

ابھی کمیونسٹوں کی بائبل یعنی ''داس کیپٹال'' کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ امریکہ میں '' تحریک عوامیت '' (Populism) کا ظہور ہؤا۔ '' پاپولزم '' '' ناروڈازم '' کا لفظی ترجمہ ہے جو روسی زبان کے لفظ ' نارود ' سے مستخرج ہے، جس کا مطلب ہے عوام یعنی کسان۔ روس میں کسانوں نے سوچا تھا کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں اس لیے وہ انقلاب برپا کر سکتے ہیں اور یہ کہ وہ حقیقت میں انقلاب انگیزی کے لیے مزدوروں سے زیادہ اہل ہیں۔ امریکی '' عوامیت پسند '' (Populists) تیزی سے زور پکڑتے گئے حتیٰ کہ اپنے میں سے اپنی پسند کا صدر مملکت منتخب کرتے کرتے رہ گئے۔ بہر حال امریکہ میں انتخابات کو صرف ۱۸۹۶ء میں متانت حاصل ہوئی جب انتخابی نعروں کی سطحیت قدرے حقیقی اسباب اور لائحہ ہائے عمل میں تبدیل ہو گئی۔ یہاں ہمیں '' تحریک عوامیت '' کے آغاز اور انجام سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ہمیں اس واقعے سے سروکار ہے کہ اس تحریک کے دوران میں فریڈرک ٹی۔ مارٹن نے، جو امریکی طبقۂ امرا کا رکن تھا، غصے کے عالم میں صاف صاف وہ باتیں لکھیں جن سے سرمایہ داری کے اصلی خط و خال واضح ہو گئے:

> '' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ کونسی سیاسی جماعت برسراقتدار ہے اور نظام حکومت کس صدر کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نہ سیاست کار ہیں نہ عوامی مفکر۔ ہم اہل دولت ہیں اور ہم امریکہ کے مالک ہیں۔ ہمیں نے امریکہ حاصل کیا تھا۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ کیسے؟ ۔ لیکن اب ہم اسے اپنے قبضے میں رکھنے کا عزم رکھتے ہیں اور اس کے لیے ہم اپنی بے پناہ حمایت، اثر و رسوخ، دولت، اپنے سیاسی تعلقات، اپنے خریدے ہوئے سینٹ کے ارکان، اپنے بھوکے کانگرسیوں، اپنے بازاری مقرروں کو اپنے خلاف مفاد آئین سازی، سیاسی پلیٹ فارموں اور صدارتی مہموں کے مقابلے میں پوری شد و مد سے جھونک دیں گے۔''
>
> (بحوالہ فاسٹر ای۔ ڈلس۔ ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۱۸۶۵ء کے بعد سے ''۔ مطبوعہ ۱۹۵۹۔ صفحہ ۱۲۸)*

*Foster E. Dulls, ''The United States Since 1865'', Ed. 1959, P. 128

یہ ہے سرمایہ داری کی خانگی روایت ! بیرونِ خانہ یعنی ممالک غیر میں اس کے ہاتھوں کیا کیا ہؤا اور کیا کیا ہو رہا ہے ، وہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے ۔ ہم اپنے آپ کو نسبتاً زیادہ قریبی زمانے اور واقعات کے بجائے اعلانوں اور فیصلوں تک محدود رکھیں گے ورنہ یہ داستان ایک مضمون میں نہ سما سکے گی ۔

دوسری عالمی جنگ میں پر زور احتجاجوں کے باوجود امریکہ اس امر کو تسلیم کرنے سے متواتر انکار کرتا رہا کہ یورپ میں جنگ کے پس پردہ کوئی سیاسی غرض کار فرما تھی ۔ امریکہ کی اپنی اغراض یورپ کے بجائے بحرالکاہل سے وابستہ تھیں ۔ لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو سوویٹ یونین کے عمل اور روپے اور ماؤزے تنگ کے خلاف خانہ جنگی میں چیانگ کائی شک کی ابتر حالت سے امریکہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ڈھال جس کے پیچھے امریکہ سیاسی علیحدگی کے خراٹے لے رہا تھا اور یورپی طاقتوں کی معیت میں مصروفِ استحصال تھا ، اب باقی نہ رہی تھی ۔ پھر چچا سام ، اب پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے علی الرغم ، مہاجنی گدی پر بیٹھ کر اپنے دیے ہوئے قرضے کی رقوم بھی یورپی طاقتوں سے وصول نہ کر سکتا تھا ۔ تب امریکہ نے سرمایہ دار مغرب کی قیادت سنبھال لی ۔ اس سے مشرق کے لیے صرف یہ فرق پڑا ہے کہ پہلے ، استعماری دور میں ، ہر مغربی طاقت اپنے زیر قبضہ یا زیر اثر مشرقی ممالک سے بلاشرکت غیرے جلب منفعت کرتی تھی لیکن اب سرمایہ دار طاقتوں کا بلاک امریکہ کے زیر قیادت متحد ہو گیا ہے ۔ اس بلاک کے عزائم اور کارروایاں اتنی کھلم کھلا نہیں جتنی کہ اس صورت میں ہوتیں اگر اس کا طاقتور حریف کمیونسٹ بلاک موجود نہ ہوتا ۔ استعماریت کی کمزوری کا بڑی حد تک ذمہ دار کمیونسٹ بلاک ہے ، جو ایک ناگزیر حریف کی حیثیت سے ظہور میں آیا ہے ۔

مندرجہ بالا مختصر وضاحت کے بعد اب ہم سامراج کی داستان شروع کرتے ہیں ۔ ۱۹۴۷ء میں جارج کیتان نے امریکی سفارتی خدمت (ڈپلومیٹک سروس) کے شعبے کو منظم کیا اور اس کا سربراہ بنا ۔ چنانچہ امریکہ کے سفارتی نونہالوں کی پرورش اور تربیت اس قسم کی ذہنی غذا پر کی گئی :

یہ امر واقعہ ہے کہ خام مال کے بہت سے سرچشمے نئے آزاد

شدہ ممالک میں ہیں ۔ مجھے اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حالات میں ہمارے لیے خام مال کی فراہمی کچے دھاگے سے بندھی ہوئی ہے اور یہ کچے دھاگے وہ ہیں جن پر ہمیں کوئی اختیار حاصل نہیں حتیٰ کہ ہم اپنی شکایت کا ازالہ اور نقصان کی تلافی بھی نہیں کرا سکتے اور میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن خام مال کی فراہمی میں شدید خلل یا رکاوٹ واقع ہو جائے، اور وہ اس قسم کے کربناک بحران اور کشاکشوں پر منتج ہو، جو ماضی میں سامراج کا حصہ رہی ہیں ۔" (بحوالہ " امریکی خارجہ پالیسی کے حقائق" صفحہ ۵۳)

اور

" عالمی قانون کا امریکی تصور بین الاقوامی جرم کے ان ذرائع ، یعنی دیگر اقوام پر غلبے اور استبداد ، کو نظر انداز کر دیتا ہے ، جو آئینی صورتوں کو سرے سے قابل اعتنا نہیں سمجھتے یا انہیں خود اُنھی کے خلاف اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً نظریاتی حملہ ، خوف ، نفوذ اور قومی حاکمیت کے آئینی لوازمات پر درپردہ قبضہ ! بالفاظ دیگر عالمی قانون کا امریکی تصور کٹھ پتلی مملکت کی اختراع اور اور ان تکنیکوں کو نظر انداز کر دیتا ہے ، جن سے مملکتوں کو کٹھ پتلی مملکتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے — ان کی حاکمیت اور آزادی کے ظاہری خصائص کی رسمی طور پر خلاف ورزی کیے اور ان کو للکارے بغیر ! (بحوالہ کینان ، "امریکن ڈپلومیسی" صفحہ ۹۸)*

میں آپ سے کینان کی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کرنے کی درخواست کروں گا کیونکہ میں اسے ناگزیر پاتا ہوں :

اخلاق ! انفرادی تکمیل ذات کے ذریعے کے طور پر ، ہاں ۔ اخلاق ! شہری اقدار کی بنیاد اور نتیجۃً کامیاب جمہوریت کی

*George Kennan, "Realities of American Foreign Policy" & "American Diplomacy"

مقدم شرط کی حیثیت سے بھی تسلیم۔ اخلاق! حکومتی طریقوں میں ہمارے عوام کے ضمیر اور ترجیح کے معاملے کے طور پر بھی قابل قبول۔ لیکن مملکتوں کے چلن کو متعین کرنے کے لیے ایک عام کسوٹی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مختلف مملکتوں کے چلن کو جانچنے اور باہم مقابلہ کرنے کی کسوٹی کے طور پر اخلاق کو درمیان میں نہیں لایا جا سکتا۔ ان معاملات میں دوسری کسوٹیوں کو فوقیت دینا اور ان سے کام لینا ضروری ہوگا جو مقابلتہً زیادہ درد ناک، محدود اور عملی ہونگی۔'' (امریکی خارجہ پالیسی کے حقائق ' صفحہ ۴۸)

اگر سرمایہ داری کو سیاست کارانہ ناز نخرے، نظریاتی سلائم گوئی اور کاروباری روغن قاز سے محروم کر دیا جائے، تو یہ وہی کچھ رہ جاتی ہے جو مارٹن اور کینان نے بیان کیا ہے۔

پاکستان اور تقریباً تمام مشرقی مملکتیں جو سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کی پیرو ہیں، اس قدر طاقتور نہیں کہ دوسروں کی مدد کے بغیر، سرمایہ دار بلاک کی، جو امریکہ کے زیر قیادت متحد ہو چکا ہے، ترغیبات کا — جو دراصل استبداد کا دوسرا نام ہے — مقابلہ کر سکیں، چہ جائیکہ وہ اتنی طاقت کے مالک ہوں کہ اس کے بل بوتے پر کسی مغربی مملکت کو اپنے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا لیں۔ پاکستان سرمایہ داری کے صرف خانگی حصے پر عمل کرنے میں آزاد ہے۔ اور وہ ہے مارٹن کا خود غرضانہ فارسولا، جس کی رو سے اہل زر خریدے ہوئے سینٹروں، ' بھوکے کانگرسیوں ' اور ' بازاری مقرروں ' کی وساطت سے اپنی بات منواتے ہیں۔ کسی نظام پر غور کرتے ہوئے اس کی خامیاں مدنظر رکھی جاتی ہیں نہ کہ شخصیتیں۔ اس حد کے اندر رہتے ہوئے میں یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مغربی سرمایہ دار ہمارے ہاں کے سرمایہ داروں کو، جو ان کے ہم جنس ہیں، اپنا طرف دار بنانے کی کوشش نہیں کریں گے تاکہ ''آئینی صورتوں سے یکسر کنی کترا کر نکل جائیں یا انہیں خود اُنھی کے خلاف استعمال کریں؟'' اور اس طرح ''قومی حاکمیت کے آئینی ساز و سامان پر درپردہ قبضہ کر سکیں؟''

موجودہ مغربی سرمایہ داری کے لیڈروں میں ایک نوآموز یا نئے نئے تخت نشین ہونے والے نوجوان بادشاہ کا سا دم خم اور جوش و خروش پایا

جاتا ہے ۔ پرانی سرمایہ دار دنیا کے مفکر ، جن کی پشت پر دو صدیوں کا تجربہ ہے ، اس جادو کے اثر سے آزاد ہو چکے ہیں ۔ کینان نے جس سرمایہ دارانہ اخلاق کو از سر نو مرتب کیا ہے اور اس کے اطلاق کی بڑی ڈھٹائی سے تبلیغ کی ہے ، اس سے متعلق سرہملٹن گب یوں اظہار افسوس کرتا ہے :

> مشرقی آنکھوں نے مغربی معاشرے کو بدعنوانیوں کی داخلی قوتوں کے ہاتھوں گلتے سڑتے دیکھا ۔ اور ان داخلی قوتوں میں سے ایک تو منافقت ہے ۔ ظاہری خیر اندیشی اور تعاون کا دعویٰ ، دوسری وہ مساعی جن سے چند ایک کے مفاد کو دوسروں کے مفاد کی قربانی دے کر آگے بڑھایا جاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ اہل مشرق ہمارے معاشرے کے تمام خطرات اور کمزوریوں کو بھانپ گئے ہیں ۔ اس صورت حال سے پورے مغربی نظام اخلاق—انفرادی اور اجتماعی—کے متعلق کلبی عدم یقینی کا رویہ پیدا ہو گیا ہے ۔
>
> (بحوالہ " اسلامی تہذیب کا مطالعہ " صفحہ ۳۳۰)

دونوں صاحبوں نے صاف گوئی سے کام لیا ہے ۔ لیکن کینان کی صاف گوئی سرکاری قسم کی ہے اور گب کی ایک عالم کی ۔ گب یورپ میں اکیلا نہیں ۔ امریکہ میں بھی دانشوروں اور انسان دوستوں کی تعداد یقیناً بڑھ رہی ہے ۔ پورا عیسائی مغرب ایک شدید اخلاقی بحران سے دو چار ہے ۔

۱۹۱۴ء تک ، جبکہ پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا ، جدید مغربی انسان یہ فرض کر چکا تھا کہ اس کی آبائی تہذیب کی لادینی صورت ہی مہذب معاشرے کی فطری اور مکمل صورت ہے ، یعنی اسم معرفہ کا درجہ رکھنے والی تہذیب ! اور یہ تہذیب نہ صرف مکمل تھی بلکہ مستقل بھی ؛ گویا یہ اس تباہی سے محفوظ رہے گی جو بہت سی ابتدائی اور نیم مہذب ثقافتوں کو زمانۂ سابق میں پیش آ چکی تھی ۔ بنی نوع انسان کی غیر معمولی اکثریت نے مغرب کی لادینی تہذیب کو اپناتے ہی اپنے آپ کو مغرب کے بیسویں صدی کے غیر متوقع بحران میں الجھا ہوا پایا ہے ۔ اس طرح مغرب نے دنیا کو اپنے خلوص کے باوجود غیر ارادی طور پر

دھوکا دیا ہے ؛ اس نے دنیا کے ہاتھوں ایک ایسی تہذیب کا سودا کیا ہے جو وہ کچھ ثابت نہیں ہوئی جو بائع اور مشتری نے اسے خرید و فروخت کے وقت سمجھا تھا (بحوالہ آرنلڈ ٹائن بی*) پروفیسر ٹائن بی امید کرتا ہے کہ مشرق کی روحانی میراث کے " بعض ہنوز نادریافت شدہ ابر ہائے بزرگی و جلال " جو مغربیت کے عمل کے دوران میں دنیا کے مشترکہ روحانی خزانے میں شامل ہو گئے ہیں ، شاید وہ " مغربی عیسائیت کی باقیات الصالحات سے مل کر مغربی تہذیب میں متروک مذہبی عنصر کو از سر نو داخل کر سکیں ۔ "

مغرب میں مذہب کے زوال پر پروفیسر ٹائن بی کا واویلا نوعِ انسان سے ہمدردی رکھنے والوں کو مغموم کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ وہ دیکھتا ہے کہ مغربی معاشرے کی مادی زیست بھی انتہائی خطرے میں ہے ۔ اور یہ کہ " اس خلاء کو پر کرنا جو اہل مغرب کے دلوں میں مذہبی اعتماد کے بتدریج زوال اور بوسیدگی سے پیدا ہوا ہے ، واقعی مشکل ہوگا ۔**

اس موضوع پر جو ڈھیروں لٹریچر جمع ہو گیا ہے مجھے اس میں سے بہت کم سے آگاہی ہے ۔ مغرب میں " اخلاقی دیوالیہ پن " اور اقدار سے آزاد زندگی کی غارت گریوں نے یاس اور سراسیمگی پھیلا دی ہے ۔ ہر مصنف شدید تر ہوتے ہوئے بحران کی تفاصیل بیان کرتا ہے یا معاشرتی زندگی کے کسی اور پہلو کی نشان دہی کرتا ہے جو آنے والے مرض کی بیچینی کے آثار سے متاثر ہو چکا ہے ۔ اگرچہ کوئی علاج وہ تجویز نہیں کرتا لیکن ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ کم سے کم وہ اپنے لیے ضرور علاج اور دوا رکھتا ہے ۔ پروفیسر ایورٹ ہال اس صورت حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> کلیّت کی طرف بیقرارانہ رجوع ، اپنے آپ کو اپنے جوتوں کے تسموں سے پکڑ کر من مانے انفرادی فیصلے کے ذریعے سے اوپر اٹھانے کی احمقانہ کوشش ، بر خود یقین طریقے پر اندھیرے میں سیٹیاں بجانا ، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اقدار کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ کہ تمام اخلاقی فیصلے بے معنی ہیں ، یہ

---

*An Historian's Approach to Religion

**A Study of History (Abridgement), vol., I, P. 486

سب علامتی رد عمل ہیں جو لازمی طور پر عصبی نوعیت کے ہیں کیونکہ یہ نہ تو مخمصے کا سامنا کرتے ہیں اور نہ اس کا حل پیش کرتے ہیں۔ (بحوالہ "جدید سائنس اور انسانی اقدار" ۔ ایڈیشن ۱۹۵۹ء ، صفحہ ۲۹)۔

کیا اس قسم کی چیخ و پکار اور انتباہات سے ، جو سربرآوردہ مفکر شائع کر رہے ہیں صورت حال میں کسی طرح کی تبدیلی واقع ہوئی ہے ؟ افسوس کہ نہیں "۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء کے "ٹائم" (نیویارک) میں ایک مفصل مضمون "مورلز اینڈ موریلٹی" کے زیر عنوان شائع ہؤا تھا جو متعدد قابل صحافیوں کی مشترکہ تصنیف تھا ۔ اس کے بعد ایک دوسرے امریکی رسالے "نیوز ویک" کے ۴ اپریل ۱۹۶۴ء کے شمارے میں ایک اسی قسم کا مضمون "مورلز اون دی کمپس" کے عنوان سے چھپا ۔ "ٹائم" کے مضمون میں بعض غیر متوقع اعترافات اور تقابلات تھے مثلاً :

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ کمیونزم ہے جس نے مدت ہوئی 'آزاد محبت' کے بارے میں، تمام زبانوں کو خاموش کر دیا تھا مگر جو آج کی دنیا میں غالباً سب سے زیادہ کٹڑ اصولوں کی پابند قوت ہے ۔

اور

یہ کشمکش عیسائی مغرب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی ۔ بہت سی دوسری تہذیبیں اور مذاہب اپنے اندر جنس کو ایک واضح اور مثبت مقام دیتے ہیں مگر مغرب میں ان دونوں یعنی مذہب اور جنس کے مابین کشاکش اور محبت کے بہت سے پہلوؤں کے متعلق عام فکری انتشار ایک قسم کی خود اذیتی کی طرف راہنمائی کرتا ہے ، جو اطالوی مصنف لیوفیریرو (Leo Ferrero) کے بقول ، ایک چینی ماہر تحلیل نفسی کو ، جنون کی علامت معلوم ہوگی ۔

"ٹائم" سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ کبھی اپنے صفحات میں کمیونزم کی تعریف میں ایک لفظ بھی چھاپے گا جس کی دشمنی پر وہ ادھار کھائے بیٹھا ہے ، لیکن مریضانہ بے چینی اس شدت کی ہے کہ اس کے تدارک کی امید میں سیاسی اور نظریاتی عداوتیں پس پشت ڈالی جا رہی

ہیں - اپریل ۱۹۶۶ء کے "ٹائم" کے شمارے کا کور سیاہ ماتمی رنگ لیے ہوئے تھا اور اس پر یہ کتبہ تھا "کیا خدا مر چکا ہے؟" اور اس میں چھپنے والے مضمون "تھیالوجی" (Theology) میں یہ صاف صاف بیان تھا:

> اب یہ سوال محض ان متشککین کا طعن آمیز تمسخر نہیں رہا جن کے لیے بے اعتقادی ہی عقل و حکمت کا معیار ہے اور جن کے لیے نٹشے ہی وہ پیغمبر ہے جس نے ایک صدی پہلے اس سوال کا جواب دے دیا تھا - خود عیسائیت کے اندر بھی انتہائی اصلاح پسند ماہرین دینیات کا ایک چھوٹا سا گروہ بڑی سنجیدگی سے یہ کہتا ہے کہ کلیسا کو یہ امر واقع تسلیم کر لینا چاہیے کہ خدا مر چکا ہے اور اب اس کے بغیر گزارہ کرنا ہوگا -

جس قسم کا اجتماعی اور انفرادی اخلاق مغرب میں، گھر کے اندر اور گھر سے باہر؛ اندرون ملک اور بیرون ملک، دیکھنے میں آتا ہے اس کا اثر وہاں عام اذہان اور مغربی مملکتوں کے باہمی تعلقات پر ضرور پڑا ہے - انگلستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ ۱۹۵۶ء میں حملۂ سویز کے سلسلے میں مشرقی ممالک کے متعلق پالیسی کے خلاف عام احتجاج کے نتیجے کے طور پر حکومت وقت کو اقتدار سے دست بردار ہونا پڑا تھا - اس سے قبل ۱۹۵۱ء میں جنرل آئیزن ہاور کو صدارتی امیدوار کے طور پر اپنی اولیں اخباری کانفرس میں یہ وعدہ کرنا پڑا تھا کہ اگر وہ منتخب ہوگئے تو کوریا میں عارضی صلح کرانے کی کوشش کریں گے - انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا - اس سلسلے میں عوامی جذبات خاصے نمایاں تھے لیکن ایک حقیقت جو جنگ کوریا کے بعد منکشف ہوئی وہ یہ تھی کہ امریکی مسلح افواج اپنے "پیشہ ور" افسروں سمیت جنگ جیتنے کے لیے ضروری جوش و خروش سے محروم تھیں - (بحوالہ کرین برنسٹن، 'ہسٹری آف ویسٹرن مورلز' ۱۹۵۹ء، صفحہ ۴۲۱)

ویٹ نام کی جنگ کے خلاف عوامی جذبات جنگ کوریا کی مخالفت سے بھی زیادہ بپھرے ہوئے ہیں - یہ جانے پہچانے حقائق ہیں کہ ویٹ نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جلوس نکالے گئے، یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور دانشوروں نے حکومت کو عوامی یادداشتیں بھیجیں اور

بعض افراد نے از راہ قربانی خود کشی بھی کی ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امریکی عوام مسلح افواج میں بھرتی ہونے سے انکار کر رہے ہیں ، اور ویٹ نام میں امریکی فوجوں میں بغاوتیں ہو رہی ہیں اور وہ اپنی حکومت سے جنگ ختم کرنے کی اپیلیں کر رہی ہیں ۔ سابق امریکی نائب صدر مسٹر نکسن نے فوجی کمانڈروں سے بات چیت کرنے کے بعد ۔ اگست ۱۹۶۶ء کو سائیگون میں ایک بہت معنی خیز بیان دیا تھا ۔ انھوں نے ویٹ نام میں امریکی فوجوں کی تعداد میں فوری اور معتدبہ اضافے کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ’’ جنگ ویٹ نام میں تو ہم نہیں ہاریں گے ، لیکن خود اپنے ملک میں ہم یہ جنگ ہار سکتے ہیں ۔ ‘‘ کوریا کا آسیب امریکی سرمایہ داروں کے سر پر بری طرح سوار ہے ۔ لیکن امریکی عوام جانتے ہیں کہ ویٹ نام کی جنگ ان کی جنگ نہیں ہے ۔

کسی یورپی طاقت نے ویٹ نام کی جنگ کے سلسلے میں امریکہ کی کھلے بندوں حمایت نہیں کی ۔ اور فرانس تو یقیناً نہ صرف اجنبیت کا لبادہ اوڑھ چکا ہے ، بلکہ مخالفت کا بھی ۔ جونہی یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ امریکہ تیز رفتار اور مقامی جنگوں کے ذریعے سے کمیونزم کا سدباب نہیں کر سکتا ، سرمایہ دار مغرب کی قیادت اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گی ۔ سرمایہ داری آخری سنبھالا لے رہی ہے ۔ نسل پرستی ، کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے مناقشات جو اس جارحیت سے پیدا ہوئے جو وہ اپنی تعداد بڑھانے کے لیے اختیار کرتے تھے ، سیاسی اقتدار کی اجارہ داری کے لیے یہودیوں اور کیتھولکوں کا گٹھ جوڑ ، کلوکلکس کلین کے فشیتی رجحانات جو یہودیوں ، کیتھولکوں اور حبشیوں سب کے مخالف ہیں ، یہ ہیں وہ بعض حقائق جو امریکی قوم کی سالمیت کے لیے سخت خطرہ بن گئے ہیں ۔

کافرانہ سوشلزم

یہ مسلّم ہے کہ مغربی سوشلزم میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ لیکن یہ کہنا کہ سوشلزم ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے ، جس کا واحد یا بڑا مقصد مذہب کی تنسیخ اور انہدام ہے ، سوشلزم اور مذہب دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی ۔ ’’ کمیونسٹ مینی فیسٹو‘‘ جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہؤا ، اس کا ہدف بورژوائی طبقہ ہے ۔ بورژوا کا اصطلاحی مطلب ہے وہ جدید

سرمایہ‌دار طبقہ جو اجتماعی ذرائع پیداوار کا مالک ہے اور مزدوروں سے کام لیتا ہے ۔ مندرجہ ذیل مواد "کمیونسٹ مینی فیسٹو" سے لیا گیا ہے ، اس کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اخلاق اور مذہب کے متعلق کمیونسٹ نظریہ کیا ہے :

> بورژوائی طبقے نے جاگیرداری ، سرقبیلی اور دیہی تعلقات کا خاتمہ کر دیا ہے ۔ اس نے مذہبی ولولے ، شجاعانہ جوش ، خالص جذباتیت کے بہشتی کیف و سرور کو انانیت پرستی کے برفانی پانیوں میں ڈبو دیا ہے ۔ اس سے شخصی قدر و قیمت صرافی قدر و قیمت میں تبدیل ہو گئی ہے اور بے شمار ناقابل عمل منشوری آزادیوں کی جگہ "آزاد تجارت" جیسی حد سے گزری ہوئی ناقابل جواز آزادی نے لے لی ہے ۔ بورژوائیت نے ہر اُس پیشے کو جو اب تک معزز و محترم سمجھا جاتا تھا ، عزت و احترام کے ہالۂ نور سے محروم کر دیا ہے ۔ اس نے طبیب ، وکیل ، پروہت ، شاعر ، سائنس دان کو اپنا تنخواہ دار مزدور بنا لیا ہے ۔ اس نے کنبے کا جذباتی نقاب پھاڑ کر دور پھینک دیا ہے اور عائلی تعلق کو محض مالی تعلق کی سطح پر گرا دیا ہے ۔۔۔

کارل مارکس نے مختلف اثرات کے ماتحت کام کیا ۔ ڈارون جس کے نظریۂ ارتقا نے گناہ آدم ، کفارہ اور عیسائیت کے بعض دوسرے اہم اعتقادات پر ضرب کاری لگائی ، وہ مارکس کا ہم عصر تھا ۔ اس کے دوسرے ہم عصروں میں کار کے گارڈ اور نٹشے جیسے فلسفی بھی تھے ۔ اور پھر انگریزی شاعر سونبرن تھا ، جس نے ۱۸۷۱ء میں اپنی کفرانگیز نظم "حمد انسان ۔ مرثیۂ خداوندی" *لکھی ۔ کافرانہ فلسفے کی حمایت و اشاعت میں مارکس تنہا نہ تھا ۔ جی ۔ جے ۔ ہولی اوک ، جس نے لادینیت کی پہلے پہل تعریف متعین کی ، اور جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے ، وہ بھی مارکس کے معاصرین میں سے تھا ۔ مارکس پر ایک اہم اثر ، غالباً عظیم ترین اثر ، جنگ کریمیا کا ہؤا ۔ اس نے دیکھا کہ پروٹسٹنٹ انگلستان اور کیتھولک فرانس ، جو سیاسی لحاظ سے ہمیشہ سے ایک دوسرے کے

*Hymn of Man, an Elegy of God

دشمن چلے آتے تھے اور اعتقادی لحاظ سے ایک دوسرے کو کافر و ملعون ٹھہراتے تھے ، جنگ کریمیا میں مسلم ترکی کی ، '' مقدس روس '' کے خلاف حمایت اور حفاظت کر رہے تھے۔یعنی اُس روس کے خلاف ، جو یہ کہنا چاہیے کہ '' بے دین '' مسلمانوں کو یورپ سے نکالنے اور سلطان ترکی کی عیسائی رعایا کو آزاد کرانے کے لیے لڑ رہا تھا ۔ مارکس نے جنگ کریمیا کے متعلق کثرت سے لکھا ہے ۔

اینگلز نے لکھا ہے کہ اس کا اپنا اور مارکس کا مقصد اس وضاحت سے زیادہ نہ تھا کہ مادی نقطۂ نظر سے تاریخ کا فیصلہ کن اصول یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے لیے یہ ضرور ممکن ہونا چاہیے کہ اپنی تجدید کر سکے اور از سر نو شباب و قوت حاصل کر سکے اور یہ دعویٰ کہ اقتصادی حالات ہی معاشرے کے لیے فیصلہ کن ہوتے ہیں ، اس اصول کی تحریف اور سوئے تعبیر کے مترادف ہوگا ، کیونکہ اقتصادی صورت حال بے شک بنیادی اہمیت رکھتی ہے لیکن اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہے اس کے گوناگوں عناصر بھی اہم ہیں ۔ مثلاً سیاسی ، عدالتی فلسفیانہ نظریات اور مذہبی اعتقادات۔ اور یہ وہ عناصر ہیں جو وقتاً فوقتاً تاریخ کی راہ متعین کرنے میں دوسرے عناصر سے اہم تر کردار ادا کرتے رہے ہیں (منتخبات کارل مارکس۔صفحہ ۳۲۱)

یہ بجا طور پر فرض کیا جا سکتا ہے کہ مارکس اور اینگلز مذہبی اعتقادات کے سرے سے مخالف نہ تھے لیکن غیر کمیونسٹ معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح وہ اس مذہب کو منظوریٔ کا پروانہ بھی نہیں دیتے تھے جو امن ، مسرت اور ترقی کی راہ میں حائل ہو۔

'' کمیونسٹوں کے ہاتھوں مذہب کی سرکوبی کے متعلق دستاویزات کا مجموعہ '' میں (جسے بولیسلاسز سیناک (Boleslaw Csczesniak) نے ترجمہ اور مدون کیا اور ناٹرڈیم پریس نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا) ہم دیکھتے ہیں کہ لینن نے ۱۹۰۵ء میں اعلان کیا تھا کہ '' ہر شخص کو مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ جونسا مذہب چاہے اختیار کرے ، اور چاہے تو کوئی بھی مذہب اختیار نہ کرے '' (صفحہ ۴۲) - ''پچھیتی گھاس '' (The Aftermath) پہلی عالمی جنگ کے بعد لکھی گئی ، جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ، مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس میں چرچل ہمیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اپنے آخری ایام میں لینن اپنے ہی معزول کردہ خداؤں سے انتھک اور مسلسل دعائیں مانگتا رہتا تھا ۔

تو آخر کیا بات ہوئی کہ روسی کمیونسٹوں نے برسراقتدار آتے ہی مذہب کے خلاف سخت گیرانہ اقدامات کیے ؟ انھی دستاویزات سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے ۔ قرون وسطیٰ کے یورپ میں کیتھولک کلیسا کی زمینداری سب سے بڑی تھی ، خود بادشاہ سے بھی بڑی ۔۔ اس لیے کلیسا کسانوں کی نفرت کا سب سے بڑا اور مقبول ہدف تھا ۔ روس جو " تحریک اصلاح دین " اور فرانسیسی انقلاب سے متاثر نہیں ہؤا تھا ، وہاں " گریک آرتھوڈوکس چرچ " ایک وسیع ، دولتمند اور طاقتور ادارہ تھا اور زار شاہی کا ایک حصہ ۔ " بشپ اور پادری دراصل حکومت کے تنخواہ دار ملازم تھے ۔ " اور آرتھوڈوکس چرچ " وسیع سلطنت کے مختلف صوبوں میں کسانوں اور عوام پر شاہی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ادارہ تھا ...... جب زار کو معزول کر دیا گیا ، تو لوگوں کو ہر قسم کے تشدد سے ، جس میں مذہبی تشدد بھی شامل تھا ، مخلص کا احساس ہوا " (صفحہ ۵) ۔ ان دستاویزات میں ہمیں سونے کے انباروں کی بھی تفصیل ملتی ہے جو کلیساؤں کی تجوریوں میں سے برآمد کیا گیا ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عیسائیوں نے زار شاہی کی بحالی کے لیے کمیونسٹوں سے جنگ کی ۔ یہ حالات اور بیرونی مداخلت جو " جنگ مداخلت " کی صورت اختیار کر گئی ، سوویٹ یونین میں مذہب کے لیے فضا کو ناساز گار بنانے کا باعث ہوئے ۔ کمیونسٹ جو پہلے ہی مذہب کے دلدادہ نہ تھے ، نئے نظام میں کسی ایسے خدا کو جگہ دینے پر آمادہ نہ تھے ، جو ہمیشہ زار کا طرفدار اور شریکِ جرم رہا تھا ۔

چین میں زمانۂ قدیم سے تمام مذاہب کو برداشت کیا جاتا رہا ہے ۔ روس کے برعکس ، جہاں راسخ الاعتقاد کلیسا سے برگشتگی کو تخت شاہی سے غداری تصور کیا جاتا تھا ، چین میں کوئی بھی مذہب حکومت کا حصہ نہ تھا ۔ چینی کمیونسٹوں کی مذہب سے مقابلتہً زیادہ نرمی برتنے کی یہی وجہ ہے ، باوجودیکہ وہ نظریاتی لحاظ سے زیادہ کٹر اور قدامت پسند ہیں اور روسی " ترمیمیت " پر معترض ہیں ۔ ایک سرکردہ امریکی صحافی فیلکس گرین (Felix Green) نے جو ۱۹۵۹ء میں چین گیا تھا اپنی کتاب میں ایک چینی کیتھولک پادری کی شہادت کی بنا پر لکھا ہے کہ چینی کمیونسٹوں نے مذہب پر تشدد کرنے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ، مذہبی اجتماعوں کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ان میں شامل ہونے والے

مندوبوں کو ریل کے سفر کے فری پاس دیے گئے -

روس میں بھی آرتھوڈوکس چرچ کے بطریق کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی ، اگرچہ زار شاہی کے زمانے کے اختیارات اور مراعات کا خاتمہ ہو گیا تھا - اب یہ اطلاع ملی ہے کہ سوویٹ یونین میں انقلاب کے بعد پہلی دفعہ ۱۱ - اگست ۱۹۶۶ء کو بائبل کا ایک تحقیقاتی مطالعہ چھپا ہے ، جس میں حد سے متجاوز نقد و تعریض اور مذہب کے خلاف لعن طعن سے پرہیز کیا گیا ہے - کتاب کے مصنف پولستانی ادیب زینن کوسی بوفسی (Zenon Kosibovsy) نے بائبل کی تشریح و تفسیر کی بنیاد آثار قدیمہ اور قدیم تاریخ پر رکھی ہے - اس کی ایک لاکھ جلدیں کتب فروشوں کو مہیا کی گئی ہیں - ہو سکتا ہے کہ سوویٹ یونین میں یہی مذہب کا آغاز نو ہو !

روسی اور چینی مسلمان

مغربی مصنف وقتاً فوقتاً سوویٹ یونین اور چین میں مسلمانوں کی جو تعداد بیان کرتے رہتے ہیں ، مجھے اس کے متعلق سخت شبہہ ہے - یہ تعداد آج سے پچاس سال پیشتر ، جبکہ سابق حکومتیں ہر دس سال بعد مردم شماری کراتی تھیں ، اور مذہبی اعداد و شمار بڑی آزادی سے مہیا کرتی تھیں ، کی بتائی ہوئی تعداد سے تقریباً آدھی ہے - لیکن یہاں اس کے متعلق مفصل بحث کرنے کا موقع نہیں - میرا اندازہ ، جس کی بنیاد مغربی مصنفوں ہی کی تحریروں پر ہے ، یہ ہے کہ سوویٹ یونین اور چین میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بارہ کروڑ ہے اور اس کی اکثریت چین میں ہے -

یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ چین میں مسلمانوں سے نسبتاً بہتر سلوک کی وجہ یہ ہے کہ چینی کمیونسٹ چین کے ارد گرد کے ممالک کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کی تالیف قلوب کرنا چاہتے ہیں - کچھ بھی ہو ، سوویٹ یونین اور چین میں مسلمان سوشلزم کے ساتھ بقائے باہمی کے اصول کو اپنا چکے ہیں - روس کے متعلق بھی والٹر کولارز (Walter Kolarz) نے اپنی کتاب '' سپوتینکی دہریت کا تعارف'' (Sputnik Ateista : A Hand-book of the Atheist) میں لکھا ہے کہ سوویٹ یونین میں مسلمانوں سے حکومت کے رویے میں تبدیلی کا امکان ہے اور یہی وجہ ہے کہ تاشقند اور بخارا میں اسلامی تعلیم و تربیت کے مرکزوں ، سوویٹ یونین

میں شامل مسلمان ری پبلکوں کی انتظامیہ کے ساتھ اماموں اور مفتیوں کی ائتلافیت اور حج کے لیے مکہ جانے والوں کی مختصر تعداد کو دنیا کے مسلمانوں کا قرب حاصل کرنے کے لیے اہم اور قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ کولارز کے بیان کے مطابق آج سے دس سال پہلے تک جو تطہیریں، قتل عام اور کثیرالتعداد جلاوطنیاں عمل میں لائی جاتی تھیں، اُن سے سوویٹ یونین کے مسلمانوں کی سپرٹ دب نہ سکی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بڑے شہروں میں اسلامی شعار کی پابندی میں کمی آ گئی لیکن اسلام کے عام اثرات برقرار رہے اور یہ کہ " نسبتاً زیادہ عیار طبع مخالفین مذہب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کے خلاف جنگ کرنے میں انہیں ایسے تصورات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، جن کی جڑیں مذہب اسلام میں پیوست ہیں لیکن پھر بھی وہ جدید انسان کے لیے کشش کا باعث ہیں۔" اور یہ کہ اسلامی اخوت جو قومی اور معاشری حد بندیوں سے بالاتر ہے، کمیونسٹ پرولتاری بین الاقوامیت کی حریف ہے۔"

ربانی نظام

قبل اسلام کے عربوں سے بربریت منسوب کی جاتی ہے مگر شاید یہ ایک عاجلانہ فیصلہ ہے۔ کیونکہ بربریت کی اصطلاح یونانیوں نے ان غیر ملکیوں کے لیے وضع کی تھی جو یونانی زبان نہیں جانتے تھے۔ بعد ازاں یہ اصطلاح ان کندۂ ناتراش اور غیر مہذب قوموں کے لیے استعمال کی جانے لگی جو دائرۂ عیسائیت سے خارج تھیں۔ قبل اسلام کے بت پرست عرب اپنا مردانگی کا شیوہ اور مہمان نوازی کی روایت رکھتے تھے، اور لسانی غرور بھی، جس کی بنا پر وہ غیر عرب دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے ایک نسل پہلے ایسا ہؤا کہ ہندوستان اور بحیرۂ روم کے ممالک کے درمیان خشکی کے قدیم اور جانے پہچانے راستے ایران اور بازنطینی سلطنت کے درمیان لامتناہی جنگوں کی وجہ سے مخدوش ہو گئے تھے۔ ایک متبادل راستہ، جو جدہ، مکہ اور مدینہ سے ہو کر جاتا تھا، دریافت ہو جانے سے مکہ اور مدینہ، خاصکر مکہ جو عرب کا قدیمی اور ثقافتی مرکز تھا، خوشحالی کے نئے اور غیر متوقع مواقع سے ہمکنار ہو گئے۔ چنانچہ وہاں ملک التجار پیدا ہو گئے جو اپنے قبیلے اور معاشرے سے دور ہونے لگے۔ انہوں نے اجارہ داریوں کے

ذریعے سے تمام مسابقت کو ختم کرنے کی کوشش کی تاکہ تجارت اُنھی کے ، یعنی اقلیت کے ہاتھوں میں مرکوز رہے ۔ منٹگمری واٹ کہتا ہے کہ '' قرآن کا نزول صحرائی فضا میں نہیں ہوا بلکہ اعلیٰ مالیاتی ماحول میں ۔'' اور یہ کہ '' مکہ تجارتی مرکز کے علاوہ کچھ اور بھی تھا__اس کے سربرآوردہ لوگ ماہرین مالیات تھے جو قرضے کے درو بست میں مہارت رکھتے تھے ، وہ ہوشیار سٹہ باز تھے اور عدن سے غازہ اور دمشق تک نفع بخش کاروبار کے امکانات میں انہیں دلچسپی تھی '' (بحوالہ '' محمد آف مکہ '' صفحہ ۳) ۔

عرب میں دریا نہیں ہیں اور اس کے بیشتر حصے میں سالہا سال تک بارش کا ایک قطرہ تک نہیں گرتا ۔ ظاہر ہے کہ اس '' وادی غیر ذی زرع '' میں زراعت کی حالت کبھی ایسی صنعت کی سی نہیں رہی جس پر کوئی بڑا کاروبار نشو و نما پا سکتا ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا عرب کم و بیش آج کے عرب سے مشابہ تھا ، جسے معدنی تیل کے ذریعے سے اچانک اور غیرمتوقع خوشحالی نصیب ہوئی ہے۔ پیغمبری عہد کے عرب کا حالیہ عرب سے موازنہ ہمیں اُن اسلامی احکام کے سمجھنے میں مدد دے گا جن سے

۱ ۔ غلامی منسوخ ہوئی ،
۲ ۔ مجلسی مرتبے ، دولت ، نسل اور رنگ سے بالاتر ہو کر انسانی مساوات قائم ہوئی ،
۳ ۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیے گئے ،
۴ ۔ تقسیم دولت کے لیے زکوٰۃ اور صدقات مقرر کیے گئے ،
۵ ۔ قانون وراثت کی تشکیل ہوئی ، جس سے تمام بیٹوں ، بیٹیوں (جن میں لونڈیوں سے اولاد بھی شامل ہے) کو یکساں حقوق ملے ،
۶ ۔ ربا حرام قرار دیا گیا ،
۷ ۔ سب کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ، اور
۸ ۔ پروہتی نظام کے قیام کی ممانعت کی گئی ۔

مندرجہ بالا موضوعات میں سے ہر ایک مفصل تشریح و تفسیر کا مستحق ہے لیکن یہاں صرف غلامی اور زکوٰۃ کی مختصر سی وضاحت کی جا سکتی ہے :

غلامی

غلامی سراسر ایک اقتصادی نظام تھا اور اتنا ہی قدیم جتنا کہ خود دنیا ۔ یونانیوں ، عیسائیوں ، زرتشتیوں اور دوسروں نے اسے فطری اور معقول قرار دیا تھا ۔ قرآن کی متعدد آیات میں سے یہاں صرف ایک کا حوالہ دینا کافی ہوگا :

> اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مال دے کر آزادی کی تحریر چاہیں ، تو انھیں فارغ خطی لکھ دو بشرطیکہ ان میں بہتری کے آثار پاؤ ۔ اور انھیں اللہ کے مال میں سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے " (سورۂ النور ، آیت ۳۳) ۔

اس حکم سے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہو گئی کہ آزاد شدہ غلام کی معاشرتی اور معاشی بحالی کے لیے روپے پیسے سے اس کی مدد کریں تاکہ بڑھاپے یا اپاہجی کی حالت میں جب وہ مالک کے کام کا نہ رہے تو اسے گھر سے نہ نکال دیا جائے ۔ قرآن کے محکمات میں سے ایک وہ ہے ، جس سے انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک آزاد مرد کی لونڈی کی اولاد کو اس کی آزاد بیوی کی اولاد کے برابر حقوق دیے گئے ۔ مقدم الذکر کی اولاد خود بخود آزاد قرار پائی ۔ قرآن نے صرف ان کافروں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں ۔ بعد ازیں حضرت عمر نے حکم دے دیا کہ کوئی بھی عرب جو کسی قبائلی جنگ میں قید ہو جائے غلام نہیں بنایا جائے گا (بحوالہ جنرل سر بی ۔ گلب ، " عربوں کی عظیم فتوحات ") *

نویں صدی عیسوی میں خلیفہ المہدی کے بیٹے ابراہیم نے ، جو ایک حبشی لونڈی کے بطن سے تھا ، اپنے نامور عم زاد ہارون الرشید کے مقابلے میں خلافت کا انتخاب لڑا تھا ، اور یہ وہ ہارون الرشید ہے ، جو تاریخ کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے تھا۔ پہلے تین کو مستثنیٰ کرکے باقی تمام عباسی خلفا لونڈیوں کے بطن سے تھے ۔ اور یہی حال اکثر عثمانی سلاطین کا تھا حتیٰ کہ طاقتور ترین عثمانی سلطان سلیمان اعظم کی ماں بھی ایک لونڈی تھی ۔

اب اسلام سے باہر بھی ایک تقابلی نگاہ ڈالیے ۔ جسٹینین کے قانون (چھٹی صدی) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے غلاموں کو مراعات

* The Great ArabConquests by General Sir B. Glubb.

ملیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قانون کی رو سے باپ کو اختیار دے دیا گیا کہ اپنے بچوں کو غلامی میں فروخت کر سکتا ہے ۔ نیز اسی قانون سے زرعی غلامی (serfdom) کا آغاز ہؤا ۔ اور یہ زرعی غلامی عام غلامی سے بدتر تھی کیونکہ اس سے رہائی نہیں مل سکتی تھی ۔ زرعی غلام مستقلاً اپنے مالک کی زمین پر کام کرتا تھا اور طرح طرح کے ٹیکس ادا کرتا تھا ۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی تک ایک ٹیکس اپنی بیوی کو جاگیردار سے بچانے، چھڑانے کے لیے دینا پڑتا تھا ، کیونکہ جاگیردار اپنے زرعی غلام کی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ پہلی رات خود گزارنے کا حق رکھتا تھا ۔

جب ۱۸۰۸ء میں سمندر پار کی تجارت غلاماں بند کر دی گئی ، تو امریکہ کی جنوبی ریاستیں اس کا مرکز بن گئیں ۔ ” غلامی کے کاروبار کی ایک عجیب اور مکروہ خصوصیت یہ تھی کہ ایک گورا جو لونڈی غلام رکھتا تھا ، اپنی لونڈیوں سے اولاد حاصل کر سکتا تھا لیکن یہ اولاد بھی اس کی غلام ہوتی تھی ، جسے روپے کی ضرورت پڑنے پر وہ فروخت کر سکتا تھا “ ۔ (بحوالہ : برٹرینڈ رسل ”سائنس کا معاشرے پر اثر “ صفحہ ۳۲) *
” اعلان آزادی غلاماں “ (یکم جنوری ۱۸۶۳ء) کے اجرا سے پہلے لنکن کانگرس پر زور دیتا رہا تھا کہ ان ریاستوں کو مالی امداد دی جائے جو ” غلامی کو بتدریج منسوخ کر رہی تھیں تاکہ نظام میں تبدیلی سے لاحق ہونے والے نقصانات کی تلافی ہو سکے ۔“ یکم دسمبر ۱۸۶۲ء کی کانگرس کو لنکن نے جو پیغام دیا ، وہ اس سلسلے کی آخری کڑی تھا ۔

اسلام بین‌الاقوامی سطح پر غلامی کا انسداد نہیں کر سکتا تھا ، تاوقتیکہ غیر مسلم قومیں بھی تہذیبی لحاظ سے مسلمانوں کے ہم پلہ نہ ہو جائیں ۔ گبن کا بیان ہے کہ قرون وسطیٰ کی عیسائی قومیں باہمی خانہ جنگیوں میں مغلوب ہو جانے والے ہم مذہبوں کو آختہ کر دیتی تھیں ۔ ذرا اس بدسلوکی کا مقابلہ اس حسن سلوک سے کیجیے جو مسلمان جنگی قیدیوں سے روا رکھتے تھے ۔ خلیفہ المہدی (نویں صدی عیسوی) نے عیسائی جنگی قیدیوں کے لیے بغداد میں گرجا تعمیر کرایا تھا ۔ (بحوالہ سر ٹامس آرنلڈ : ” تبلیغ اسلام “) ** ۔ درحقیقت صحیح قرانی روح کے لحاظ سے جنگی قیدی غلام نہیں ہوتے تھے ۔ انھیں مسلم قیدیوں کے ساتھ تبادلے یا

---

* "The Impact of Science on Society," Ed., 1959 P. 32.
** Sir Thomas Arnold : The Preaching of Islam

فدئیے کے لیے رکھا جاتا تھا کیونکہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی رہائی کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔

زکٰوۃ

بعض دفعہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ زکٰوۃ از قسم صدقہ و خیرات ہے اس لیے اگر اس کی وصولی میں زبردستی سے کام لیا جائے تو زکٰوۃ ادا کرنے والا اجرو ثواب کا مستحق نہیں رہتا۔ لیکن صدقہ و خیرات کو زکٰوۃ سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ صدقہ و خیرات نسبتاً بہت زیادہ وسیع معنی کے حامل ہیں۔ احادیث کے مطابق ظاہری خوش اخلاقی بھی صدقہ و خیرات میں داخل ہے۔ اور جانوروں پر رحم و مہربانی بھی صدقہ و خیرات ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن زکٰوۃ کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے اور زکٰوۃ سے زائد جو کچھ راہ خدا میں دیا جائے، وہ صدقہ و خیرات کہلاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر نے فرمایا تھا ......" خدا کی قسم میں ان لوگوں سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکٰوۃ میں فرق کریں گے کیونکہ زکٰوۃ جائداد پر ٹیکس ہے۔ خدا کی قسم! اگر لوگ ایک بکری کا بچہ جو رسول اکرم کے زمانے میں دیا کرتے تھے، اب دینے سے انکار کریں گے، تو میں اُن سے جنگ کروں گا" (بخاری ۲۴ : ۱)۔ یہ امر کہ زکٰوۃ جائداد، بشمول بچت، پر ایک ٹیکس ہے، ترمزی کی اس حدیث سے واضح ہے جو مشکٰوۃ (٦) میں نقل ہوئی ہے:

> رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یتیم کے سرپرست کو تاکید کی کہ وہ یتیم کے مال و متاع سے تجارت کرے اور اُسے یونہی بیکار و بےحاصل نہ پڑا رہنے دے کہ زکٰوۃ اسے کھا جائے۔

مدینے میں یہ دستور تھا کہ ایک شخص کی زمین دوسرا بٹائی پر لے کر کاشت کرتا تھا۔ اور اس طریقے کو "مخابرہ" کہتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'مخابرہ' سے منع فرمایا۔ اگرچہ جس راوی تک اس حدیث کا سلسلہ جاتا ہے، اس نے مزید سوالات کے جواب میں اپنی طرف سے اضافہ کرکے کہا کہ جنس کے بجائے نقدی لینے میں کوئی ہرج نہیں (بخاری ۴۱ : ۱۹)۔ لیکن بخاری (۱۲ : ۱۳) میں اس سے کہیں زیادہ

صحیح حدیث موجود ہے جس کی صحیح مسلم اور مشکٰوۃ سے تائید ہوتی ہے :

" عمرو رضؓ نے طاؤس رحؒ سے کہا " تجھے چاہیے کہ مخابرہ ترک کر دے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس سے منع فرمایا تھا۔" اور طاؤسؒ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے انہیں بتایا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ اگر تم میں سے کوئی اپنی زمین اپنے بھائی کو تحفتہً دے دے، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کے بدلے میں کوئی مقررہ رقم لے۔" قرآن اور حدیث کی اصطلاح میں ' بھائی ' کا مطلب مسلمان بھائی ہے، کیونکہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور پھر بخاری (۵۴ : ۱۹) میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس زمین کے استعمال کے بارے میں مشورہ چاہا، جو انہیں تازہ تازہ خیبر میں ملی تھی اور جس سے زیادہ قیمتی جائداد ان کے اپنے بیان کے مطابق کبھی ان کے پاس نہیں رہی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے وہ زمین وقف کر دی، اس طرح کہ نہ تو وہ کسی کو ورثے میں مل سکتی تھی اور نہ فروخت کی جا سکتی تھی۔

مغربی مصنف اس واقعے کا ذکر تحسین کے ساتھ کرتے ہیں کہ جب ایران کی فتح کے بعد عرب سپہ سالاروں نے مغلوب قوم، جو ہنوز مسلمان نہ ہوئی تھی، کی زمینیں آپس میں بانٹ لینے کی تجویز کی تو خلیفہ عمرؓ نے انہیں لکھ بھیجا کہ " زمین کو عوام کے پاس رہنے دو تاکہ وہ اس کی زرخیزی و کاشت کا مناسب انتظام کرتے رہیں " (بحوالہ : ول ڈیورانٹ " عہد ایمان " * صفحہ ۲۲۷)

کوئی روپیہ ادھار دے یا ناقابل صرف زمین، اور اس کے بدلے کسی دوسرے کی محنت کا پھل اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر کھائے، تو ہر دو صورت میں بات ایک ہی ہے، یعنی یہ ربا ہے۔

کمیونزم سے پہلے کے کمیونسٹ

اقلیت کے ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز ہمیشہ عوامی بغاوتوں کا باعث بنتا رہا ہے۔ جاگیرداروں کے خلاف بغاوتیں جاگیردارانہ اقتصادی نظام کا

* Will Durant , Age of Faith P. 227

حصہ رہی ہیں ۔ دولت کا ارتکاز کرنے والا دوسرا طبقہ دینی پیشواؤں ، پروہتوں یا پادریوں کا ہے ، جسے اسلام نے ممنوع قرار دے دیا ۔

اسلام کے ظہور سے تقریباً ایک صدی پہلے ایران کی مذہبی پیشوائیت کے خلاف مزدکی بغاوت نے ، جو کمیونزم کی ایک ان گھڑ صورت تھی ، نے ایرانی معاشرے کو بری طرح درہم برہم کر دیا ۔ حد یہ کہ طبقۂ امرا کی عورتیں بھی پکڑ لی گئیں اور مشترکہ جائداد کے طور پر استعمال کی گئیں ۔ مزدکیت نے ایرانی اخلاقیات کو گہرے گھاؤ لگائے ۔ اسلام کو بھی اس کے مقابلے میں کچھ مشکل کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے مزدکی عناصر کی اصلاح کر کے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا ۔

شمالی افریقہ میں عیسائی کمیونسٹ ، جو " ڈوناٹسٹس " (Donatists) کہلاتے تھے ، سرے سے پادریت کے خلاف تھے ۔ انہیں دو سو سال تک کچلا نہ جا سکا ۔ حتیٰ کہ ساتویں صدی میں یہ سارے کے سارے نقلی کمیونسٹ اسلام میں داخل ہو گئے ۔ بعد ازاں اسلام کے زیر اثر عیسائیت میں " الحادوزندقہ " کے جو واقعات پیش آئے ، وہ اتنے کثیر ہیں کہ یہاں ان کا ذکر ممکن نہیں ۔ البتہ یہ امر واقعہ ہمارے موضوع سے تعلق رکھتا ہے کہ الحاد و زندقہ کے یہ سب واقعات دراصل پادریوں کی زر اندوزی ، عیش و عشرت اور اخلاقی گراوٹ کے خلاف احتجاجات تھے ۔ اور جہاں کہیں جغرافیائی حالات مساعدت کرتے تھے ، عیسائیت کے یہ ملحد بھاگ کر اسلامی ممالک میں داخل ہو جاتے تھے ۔

عوامی غیظ و غضب اندھا ہوتا ہے ۔ اسے یہ پروا نہیں ہوتی کہ اس کا وار کس پر پڑ رہا ہے اور تباہی کس پر آتی ہے ۔ یہ تو اپنی محرومیوں کا انتقام لینے میں لذت محسوس کرتا ہے ۔ چنانچہ جب مسلمان جاذبِ "الحاد" اسلام سے سرد مہری برتنے لگے ، زکٰوۃ اور صدقات کی ادائیگی سے غافل ہو گئے ، ساسانی انداز کی بادشاہتیں قائم کر کے جاگیرداروں کی وساطت سے استحصال میں لگ گئے ، غلامی کو نیست و نابود کرنے کا عمل جاری رکھنے کے بجائے اُسے از سر نو رائج کرنے میں مشغول ہو گئے ، ساسانی طرز کے حرم قائم کر لیے اور قرآن کے احکام کو پس پشت ڈال کر حرموں کی دیکھ بھال کے لیے مردوں کو آختہ کرنے لگے ، تو محرومی و شکست خوردگی کے احساس تلے دبی ہوئی قومیں اپنے حکمرانوں کے مسلمہ اصولوں کے احترام اور لحاظ سے بے پروا ہو گئیں ۔ ان کی نظر میں صرف اس بات

کی اہمیت رہ گئی کہ ان پر حکومت کس طرح کی جاتی ہے اور کیسے کیسے مصائب انہیں بھگتنا پڑتے ہیں - دہان زخم سے پھول نہیں جھڑا کرتے!

۷۷۲ء میں مزدکی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر میدان میں آ گئے اور خلافت کو تاخت و تاراج کرنے لگے اور اس کے فرسودہ نظام حکومت کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا - خراسان کے ہاشم المقنع نے اعلان کر دیا کہ وہ خدا کا اوتار ہے اور مزدکیت کی بحالی کے لیے آیا ہے - اس نے بہت سے پیرو اکٹھے کر لیے اور چودہ سال تک شمالی ایران میں تباہی و بربادی مچائے رکھی - حتیٰ کہ ۷۸۶ء میں وہ گرفتار ہو کر مارا گیا - اس عرصے میں بعض دوسری تحریکیں بھی اٹھیں جو مزدکیت کی طرح کمیونسٹ یا نراج پسند تھیں - ان میں سے ایک "سرخ عَلَم" کے نام سے مشہور ہوئی - ۸۳۸ء میں بابک خرمی نے خروج کیا - اس کے کثیرالتعداد پیرو اپنے آپ کو "محمرہ" یعنی سرخ کہتے تھے - بابک بھی مزد کی تھا اور دوسرے مزدکیوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ناقابل تسخیر تھا - اس نے آذر بائیجان پر قبضہ کر لیا ، خلیفہ کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں اور بائیس سال تک حکومت کی - الطبری کے اندازے کے مطابق بابک نے خلیفہ کے دو لاکھ پچپن ہزار فوجیوں اور قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارا - بابک کے بعد خلفائے عباسیہ کو امن چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہؤا - چنانچہ ۸۶۹ء میں زنگی (حبشی) غلاموں نے ، جو بصرہ میں شورہ بنانے کے کام پر لگائے گئے تھے ، بغاوت کر دی - ان کے جرنیل مہلبی نے ۸۷۱ء میں بصرے پر قبضہ کر لیا- روایت ہے کہ اس نے بصرے کے تین لاکھ باشندوں کا قتل عام کیا اور ہاشمی امرا کی ہزاروں سفید فام عورتوں اور بچوں کو حبشیوں کی لونڈیاں اور غلام بنانے کے لیے لے گیا - یہ زنگی بغاوت چودہ سال تک جاری رہی اور اس نے خلافت کی اقتصادی اور سیاسی عمارت کی بنیادیں کھوکھلی کر کے رکھ دیں - چنانچہ بعد کی بغاوتوں سے نپٹنے کے لیے خلافت میں دم خم باقی نہ رہا -

اسلام کی آزمائش

یہ یقین کرنے کے وجوہ اور قرائن موجود ہیں کہ اب سوشلزم کا رویہ مذہب کی جانب پہلے کی طرح متشددانہ نہیں رہا - امید—اب تک صرف امید—کی جا سکتی ہے کہ سوشلزم آخر کار ایک ایسے مذہب کی طرف مائل

ہو جائے گی جو سائنس اور اقتصادی نظام کے متعلق اس کے نظریات سے متصادم نہ ہو ۔ سرمایہ دار نظریہ ساز مذہب کو نظر انداز کرنے کے نتائج و عواقب سے پوری طرح آگاہ ہیں ۔ لیکن کھلی اور بے روک انفرادیت نے چھپے چوری جس اخلاقی انحطاط کا آغاز کیا تھا ، اب وہ اس سے نجات کی راہ نہیں پاتے ۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ اخلاقی انحطاط بدتر صورت اختیار کرتا گیا اور دونوں عالمی جنگوں نے اسے مکمل اخلاقی ابتری میں تبدیل کر دیا ۔ اور یہ وہ اخلاقی ابتری ہے جسے اب مغرب کی مادی خوشحالی کے لیے بھی خطرہ تسلیم کیا جا رہا ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا !

سرمایہ دار مغرب کی آنکھیں کھل گئی ہیں ۔ اب یہ اپنی تہذیب کو فطری ، معقول ، آخری اور ابدی نہیں سمجھتا ۔ آشکارا طور پر ایک نظریاتی خلا پیدا ہو گیا ہے ۔

اسلام کو سرمایہ داری اختیار کرنی چاہیے یا سوشلزم ؟ ہمارے نزدیک اس سوال سے زیادہ اہم یہ امکان ہے کہ اسلام مشرق اور مغرب کے جدید معاشروں کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے لیکن اس کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے سے قائم کیے ہوئے تصورات کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں اور اس رجحان کو بھی خیر باد کہہ دیں جس سے اسلام کے بارے میں غیروں کے تعریفی بیانات ہمیں بھلے معلوم ہوتے ہیں ، قطع نظر اس سے کہ وہ ہم مسلمانوں کے متعلق کیا کہتے اور سوچتے ہیں ۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ، اگر سوویٹ یونین کے بعض خلاف مذہب پروپیگنڈا کرنے والے ، جن پر تہذیب کا ملمع چڑھا ہؤا ہے ، یہ واقعی محسوس کرتے ہیں کہ اسلام ایسی اقدار کا حامل ہے ، جو جدید انسان کے لیے کشش رکھتی ہیں ، یا اگر جرمن فلسفی جرہارڈ زکزسنی (Gerhaard Szeczesny) کہتا ہے کہ ” ایک اچھا سیلز مین جو اچھا مقرر بھی ہو اور تازہ ترین متکلمانہ تصرفات و مختارات کا ماہر ہو ، وہ یورپی عوام کو مشرف بہ اسلام کرنے کے قابل ہو سکتا ہے ۔“ (بحوالہ ” ٹائم “ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء) یا اگر پروفیسر ٹائن بی خیال کرتا ہے کہ اسلام میں ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جنھیں اپنا کر مغرب فائدہ اٹھا سکتا ہے ، یا اگر بہت سے مغربی مصنف یہ رائے رکھتے

ہیں کہ اسلام سماجی یک جہتی و انضمام کے لیے مؤثر ترین قوت ہے تو یہ سب داد و تحسین کے ڈونگرے اُس اسلام کی اکملیت کا ثبوت مہیا نہیں کرتے، جس کا عملی نمونہ ہم پیش کرتے ہیں۔ اور نہ یہ ہماری اس ہٹ دھرمی پر مہر تصدیق و جواز ثبت کرتے ہیں کہ ہمارے اسلامی عمل میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسلام ہم تک براہ راست عرب مبلغوں کے ذریعے نہیں پہنچا۔ بلکہ یہ ہم تک فوجی سپہ سالاروں کی ”ریلے“ (Relay) سے ایسے وقت پہنچا، جب مذہبی شعار کی پابندی میں پہلا سا جوش و خروش خود قلب اسلام میں بھی نہیں رہا تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں صحیح اسلامی معاشرہ کبھی بھی ظہور میں نہیں آیا۔ ہند و پاکستان کے مسلمان معاشرے کی یاد دہانی ہمیں صرف ان 'علماء' کے ذریعے ہوتی ہے، جو باستثنائے چند سلاطین وقت کی خوشنودی اور تقرب حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے تھے۔ اور سلاطین وقت بھی وہ جو صرف اپنے شاہی خاندانی مفادات سے دلچسپی اور سروکار رکھتے تھے۔ ہم نے اپنے ہندو آبا و اجداد کی رسوم و روایات کی چھاپ اسلام پر لگا کر اس کا حال پتلا کر دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ صدیوں کا میل جول سونے پر سہاگہ ہو گیا اور آخر میں ہمیں اپنے بچے کھچے اسلام کو برطانوی استعمار سے محفوظ رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس میں خارجی مواد داخل ہو گیا ہے۔ مثلاً بے لوچ عقیدہ پرستی، اقتصادی اور نقلی روحانی غرضداریاں، سخت گیرانہ حب الوطنی اور مذہبی پیشوائیت کا نظام جو اگرچہ غیر رسمی ہے مگر ہے بڑا مربوط اور اولیا پرستی اور خانقاہ پرستی ایسی بے ہودگیوں کے ساتھ ساتھ جاہل مدعیوں، جو اپنے شعبدوں کو معجزوں کا نام دیتے ہیں، کے احترام کا بھی علمبردار ہے۔ زکٰوۃ صرف قرآن اور حدیث میں باقی رہ گئی ہے۔ ہم میں سے اکثر کو یہ بھی یاد نہیں کہ زکٰوۃ ہمارے مذہب کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔ زکٰوۃ اگر کہیں دی بھی جاتی ہے تو اکثر نیاز کی دعوتوں یا خانقاہوں کی عمارتوں میں نئے بلاکوں کا اضافہ کرنے یا زیادہ سے زیادہ فرقہ دارانہ مفادات کی، جو اخوت اسلام کے اجتماعی مفادات سے متصادم ہوتے ہیں، ترقی کے لیے خرچ کی جاتی ہے۔ ہمارے ہندی اسلام میں عام طور پر صدقہ کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ خدا کی رضا جوئی کے لیے بکرا، خص کر کالا بکرا، ذبح کیا جائے۔ یہ ایک مسرت بیزار معاشرے کی افسوسناک

رواج پسندی اور توہم پرستی ہے ۔ اور یہ معاشرہ بڑے غافلانہ انداز سے اپنے رحمان و رحیم خدا کر خون آشام کالی دیوی کا روپ دیتا رہا ہے ۔ ہم میں سے خال خال اس امر سے آگاہ ہیں کہ صدقہ جو ” صدق “ سے مشتق ہے ، فرض زکٰوۃ سے زائد اور بالا نفلی خیرات ہے ۔ صدقے سے متعلق ہمارا عام تصور اتنا بے ضرر نہیں جتنا کہ فرض کیا جاتا ہے ۔ اس کا تعلق براہ راست ہمارے تصورِ خدا ، خدا اور انسان کے باہمی رشتے اور حقوق العباد سے ہے ۔

ہماری مذہبی پیشوائیت ابوحنیفہؒ اور غزالیؒ کی روح کی وارث ہونے کی مدعی ہے ۔ لیکن یہ نہ صرف ہمارے مسائل حاضرہ کو حل کرنے کی کوشش نہیں کر رہی ، بلکہ سرے سے ان سے آگاہ ہی نہیں ۔ یہ نہیں کہ دیانتدار ، پرہیزگار اور باعلم انسانوں کا فقدان ہو ، لیکن موجودہ مذہبی پیشوائیت اور ابوحنیفہؒ اور غزالیؒ کے زمانوں کی پیشوائیت میں ایک بنیادی فرق ہے ۔ قرون وسطیٰ میں دنیا میں سائنس اور فلسفہ جو کچھ بھی تھا ، وہ مسلمانوں کی ملکیت اور ان کے دم قدم سے تھا ۔ مسلمانوں نے علوم قدیمہ کا احیا کیا اور علم و فضل کے تمام شعبوں میں ٹھوس اضافے کیے ۔ یوں وہ سائنس اور فلسفے کے بانی ہوئے ، اُس زمانے میں ایک عالم تمام علوم و حکمت کا ماہر ہوتا تھا ۔ اور یہ علوم و حکمت عربی میں تھے ، جو دُنیا کی علمی زبان تھی ۔ اور اس لیے وہ عالم پورے طور پر اس قابل ہوتا تھا کہ رجحانات حاضرہ کے متعلق فیصلہ دے سکے اور یہ کہ کیا رد اور کیا قبول کیا جائے ۔ آج کل راسخ الاعتقادی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ سائنس اور فلسفے کی مخالفت کی جائے ، ان سے مکمل لاتعلقی اختیار کی جائے اور انھیں جاننے ، سمجھنے سے انکار کیا جائے ۔ موجودہ زمانے میں سماجی ، اقتصادی اور سیاسی مسائل کے رشتے بے ڈھب طور پر سائنس اور فلسفے کے ساتھ لٹے اور الجھے ہوئے ہیں ۔ اور یہ وہ صورت حال ہے جسے چودہ سو سال پہلے اسلام نے ، جو مکمل ضابطۂ حیات ہے ، بھانپ لیا تھا ۔

ہماری مذہبی پیشوائیت نے مسلمانوں کے درمیان ایک ایسے طبقے کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ، جو تعلیم کی ترقی کے ساتھ برابر بڑھتا جا رہا ہے ۔ یہ طبقہ یعنی ذہین اور روشن خیال طبقہ ، اپنے اندر جاحظ اور ڈارون ، باقلانی اور آئن سٹائن ، البیرونی اور کوپرنیکس اور عمرؓ اور لینن (مجھے چرچل سے مستعار لے کر یہ آخری جوڑا بنانے کی

الحادی حرکت معاف کر دی جائے !) کی طرف کشش محسوس کرتا ہے ۔ اُسے برے دنوں کی آمد آمد کا احساس ستا رہا ہے کہ اگر اسلام کو ، جو اہل زمین ہی کے لیے نازل ہؤا تھا ، زمین پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہ دی گئی اور وہ آسمانوں ہی میں معلق رہا ، سپوتنیکوں ، اور ' آسٹروناتوں ' کی دسترس سے دور ! ، تو مسلمانوں کو بھی وہی کچھ پیش آئے گا ، جو اس سے قبل مغربی عیسائیوں کو پیش آ چکا ہے ۔

اسلام نے ہم پر رحم کھایا اور پروہتی نظام یا پادریت سے ہماری گلو خلاصی کرائی ۔ یہ پادری یا بروہت طبقہ—وہ طبقہ ہے جس کا اولین کام دولت کا ارتکاز ، توہمات کا استحکام اور مذہبی فکر کی نشو و نما کو داغدار کرنا تھا ۔ لیکن اس کی جگہ ہم نے " تقدس " ایجاد کر لیا ، جس کی بنیاد معجزات کی روایات پر رکھی گئی ، اور یہ معجزات ہمیشہ ماضی سے متعلق ہوتے تھے اور اس لیے ان کی تصدیق اور جانچ پرکھ نہیں ہو سکتی تھی ۔ ہم نے اس تقدس کو موروثی بنا دیا اور اسے عیش و عشرت کی گود میں کھیلتے دیکھ کر خوش ہوتے رہے ۔

اس بات کا یقین صرف احمق ہی کر سکتے ہیں کہ چونکہ اسلام اپنی ربانی اخلاقیات کی وجہ سے عیسائیت اور دوسرے مذاہب سے مختلف ہے ، اس لیے یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی سماجی حیثیت سابقہ کو برقرار رکھ سکتا اور ہر قسم کے داخلی اور خارجی دباؤ کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ نظری لحاظ سے یہ دلیل خود اسلام کے خلاف جاتی ہے ۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام ایک طاقتور مخدر دوا کا کام کرتا ہے اور عملی لحاظ سے چونکہ ایک مسلمان کو آزاد مسلمان معاشرے میں ، جو اسلامی کہلاتا ہو ، کام کرتے ہوئے ہر وقت اس اسلام کی اصلی پاکیزگی اور نورانیت کی یاد دہانی ہوتی رہتی ہے ، لہذا بہ نسبت دوسرے مذاہب کے افراد کے ، مسلمان کے لیے یہ زیادہ امکان ہے کہ باغیانہ کیفیتِ مزاج پیدا کر لے ۔ لیکن جب اپنے معاشری نظام کی اسلامی نوعیت کے متعلق اس کے دل و دماغ شک اور مایوسی کی آماجگاہ بنے رہیں اور اسے متواتر یہ بتایا جائے کہ یہی نظام معاشرہ اسلامی نظام معاشرہ کی بہترین صورت ہے ، تو وہ آخرکار عصر جدید کے لیے اسلام کی موزونیت کو محل نظر سمجھنے لگتا ہے ۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کے متعلق عقیدت و احترام بھی اس امکان کی زد میں آ جاتے ہیں کہ بتدریج

اسی قسم کی بے پروایانہ اور بیدلانہ تعریف میں بدل جائیں جس سے غیر مسلم حضرات اسلام کو نوازتے رہتے ہیں۔

پیٹ خالی ہو، تو خدا یاد نہیں آتا اور نہ اس حالت میں کہ پیٹ ٹھسا ٹھس بھرا ہو اور اس میں حواس کو پراگندہ کرنے والی گیسیں اٹھ رہی ہوں۔ جس معاشرے میں صرف یہی دو قسم کے انسان ہوں، یعنی خالی پیٹ والے اور حد سے زیادہ بھرے پیٹ والے اور خالی پیٹ والوں کی اکثریت ہو، تو ان دونوں کی راہیں بڑی جلدی الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اتنی جلدی کہ ہم میں سے کچھ لوگ اس کی پیش بینی نہیں کر سکتے اور نہ اس کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہیں۔ خالی پیٹ کا زور اور دباؤ اس قدر فطری ہے کہ بھوک کے ہاتھوں، نہ کہ اپنی مرضی سے، مجبور ہو کر، گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو خدا بھی معاف کر دینے کا وعدہ کرتا ہے:

> "پھر جو کوئی بھوک سے بیتاب ہو جائے لیکن گناہ پر مائل نہ ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے" (سورہ مائدہ آیت ۴)

امام غزالی نے "منقد من الضلال" میں لکھا ہے کہ ایمان "جو آبگینے کی طرح نازک ہے، سیدھے سادے اور مستخرج اعتقادات پر مبنی ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اپنے اعتقادات کی بلندی و پستی کا شعور محض ہی اس آبگینے کی شکست کا باعث ہو جاتا ہے اور پھر اسے جوڑا نہیں جا سکتا۔ اس کے ٹکڑوں کو دوبارہ پگھلا کر صرف نئے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سادہ و معصوم اعتقادات کو ایک دفعہ خیرباد کہنے کے بعد ان کی طرف رجوع ممکن نہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آبگینۂ ایمان کو چکنا چور کر دینے والی ضربوں میں سے خالی پیٹ کی ضرب سب سے زیادہ سخت اور تباہ کن ہوتی ہے۔ تقریباً بیس سال پہلے تک برطانوی استعمار ان ضربوں کو سہتا اور اپنے اندر جذب کر لیتا تھا جن کا ہدف ایمان ہوتا تھا، اور آزادی کی امید انہیں صرف وقتی طور پر دبا دیتی تھی۔

"مشکٰوۃ الانوار" میں امام غزالی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کا حوالہ دیتے ہیں:

> "قرآن کا ایک ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، ایک آغاز بھی

ہے اور ایک انجام بھی ۔"

اس سلسلے میں یہاں قرآن کی صرف ایک آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے ، جو صاف صاف اعلان کرتی ہے کہ :

" قیامت کے دن اُسے دگنا عذاب ہوگا اور اس میں ذلیل ہو کر پڑا رہے گا ، مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے ۔ سو اللہ اُن کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا ۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے " (الفرقان ، آیات ۶۹ ، ۷۰)

" اور وہ لوگ جب انھیں ان کے رب کی آیات سمجھائی جاتی ہیں ، تو اُن پر بہرے ، اندھے ، ہو کر نہیں گرتے " (الفرقان آیت ۷۳)

قرآن صرف اُنھی کو ثواب اور مراتب کا مستحق قرار دیتا ہے ، جو حکمت اور علم رکھتے ہیں اور جو غور و فکر کرتے ہیں ۔

اپنے گھر سے باہر نظر ڈالی جائے ، تو قیل و قال سے بالا توحید ، ربانی اخلاقیات اور عالمگیر اخوت ، وغیرہ خصوصیات اسلام کے علاوہ ، جن کی غیر مسلم مفکر عام طور پر تعریف کرتے ہیں ، اسلام کی عقلیت پرستی ، ترقی پسندی اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لیے اندرونی میکانیت بھی جدید مغرب کے لیے کشش کا باعث ہیں ۔ فریڈرک اُبروک (Frederick Ueberweg) نے استعارتاً کہا ہے کہ قرآن کا ہر متن تفسیر و تاویل کی سات ، ستر بلکہ سات سو تہوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے برٹرینڈرسل نے اپنی کتاب " تاریخ فلسفۂ مغرب "* میں لکھا ہے کہ اسلام میں عالم دین اور فلسفی کے درمیان کسی قسم کا نزاع پیدا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ فلسفی کی سات سو تاویلوں میں سے کم سے کم ایک تو عالم دین کو قابل قبول ہونی چاہیے ۔ لیکن یہ ایک ایسی صورت حال کے متعلق کہا گیا ہے جہاں کسی تازہ تاویل و تفسیر پر غور کرنے کے لیے آمادگی پائی جائے ورنہ کسی قرآنی متن کی سات ہزار تاویلیں بھی سود مند نہ ہوں گی ۔

کوئی الحاقی عقیدہ یا عمل کتنا ہی غیر اسلامی یا غیر معقول کیوں

* History of Westren Philosophy

نہ ہو ، اس کی تنسیخ یا ترمیم بلکہ صحیح اسلامی روح اور نظائر کے ساتھ اس کے مقابلے کا مشورہ بھی ناگوار گزرتا ہے کیونکہ تبدیلی کو بروئے کار لانے سے اسلام کے ” خطرے “ میں پڑ جانے کا امکان ہے ۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کا آخری پیغام ہے جو تمام زمانوں اور زمینوں کے لیے نازل ہؤا ہے ۔ لیکن اسلام کو جامد اور غیر متحرک بنا دینے سے اس دعویٰ کی تصدیق و تائید نہیں ہو سکتی ۔ منطقی اور واقعاتی لحاظ سے اسلام اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آ گیا ۔ یہ ہمارے زمانے سے بھی آگے ہے اور تمام ' اکنونات ' سے آگے آگے رہے گا ۔ اگر یہ ہمارے زمانے سے آگے نہ ہوتا ، تو اس سے چمٹے رہنے اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا کوئی جواز نہ ہوتا ۔

اسلام غیر متبدل ہے اسلام کے متعلق صرف ہمارا علم و فہم بدلتا رہتا ہے اور حالات میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی رہتی ہے ۔ اگر ہم اس کی حقیقی وسعت اور روح کو نہ دیکھیں تو اس سے ہماری وابستگی اور عقیدت کا کسی دوسرے ” ازم “ کی وجہ سے برگشتگی میں تبدیل ہو جانے کا سخت اندیشہ ہے ۔ اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو !

تو کیا واقعی اسلام کی آزمائش ہو رہی ہے ؟ نہیں ، دراصل یہ ہماری اپنی آزمائش ہے ۔

اسلامی سوشلزم

اگرچہ ” اسلامک سوشلزم “ کی اصطلاح بعض دفعہ قائداعظم اور صدر ایوب خاں نے بھی استعمال کی ہے ، لیکن حال ہی میں بعض پاکستانی مصنفوں اور مقرروں نے اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے ۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ چونکہ سوشلزم میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ، اس لیے یہ اسلام کا ہم صیغہ نہیں ہو سکتا ۔ ان معترضین نے اسلام کے اقتصادی نظام کی کوئی تعریف متعین نہیں کی ، سوائے اس اصرار کے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ۔ تاہم رائج صورتِ حال کو برقرار رکھنے کا رجحان موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نئے بجٹ اور ہر پنجسالہ منصوبے کے ساتھ ہم بیش از بیش سرمایہ داری میں الجھتے چلے جائیں ۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایک نئی قائم شدہ صنعت کے لیے آسانی سے سرکاری خزانے سے معتدبہ قرضہ اور غیر ملکی زر مبادلہ فراہم کیا جاتا ہے ۔ اس کے لیے متداول نرخوں سے بہت کم نرخ پر زمین سرکاری طور پر حاصل کی جاتی ہے ۔ مشینری اور کچا مال درآمد کرنے کے لیے ہر ممکن سہولت دی جاتی ہے ۔ حفاظتی تاسیتی محاصل نئی صنعت کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ اپنی مصنوعات پاکستان میں درآمد ہونے والی مصنوعات سے اونچے نرخوں پر بیچ سکے ۔ در آنحالیکہ کافی عرصے تک اس کی مصنوعات کی کوالٹی گھٹیا رہتی ہے اور منافع پر پانچ سال تک انکم ٹیکس نہیں لگایا جاتا ، ان تمام مراعات کی قیمت عوام الناس کی جیب سے نکلتی ہے ، جنھیں روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے ۔ اس طرح دولت بتدریج اقلیت کے ہاتھوں میں مرتکز ہو رہی ہے ۔ گزشتہ سال کچھ اعداد و شمار شائع کیے گئے تھے ، جن سے معلوم ہؤا کہ بنکوں کے جاری کردہ قرضوں کی اسی فیصد رقوم صرف بڑے بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کو دی گئی تھیں ۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو اقدامات تجویز کیے گئے تھے ، ان کا نتیجہ معلوم نہیں ہو سکا ۔

جہاں تک تجارت کا تعلق ہے ، حکومت نے یہ معلوم کرکے اعلان کیاکہ بیچکوں پر مال کی قیمت اصل سےکم یا زیادہ لگانے کی بے قاعدگیوں سے اکیلے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے درآمد شدہ ہر ایک لاکھ ٹن لوہے اور فولاد پر تقریباً دس لاکھ ڈالر زر مبادلہ کا نقصان ہؤا ہے اور اگر ایسی بدعنوانیاں نہ ہوتیں تو پٹ سن اور پٹ سن کی مصنوعات کی برآمد سے پاکستان کو تقریباً دگنا غیر ملکی زر مبادلہ حاصل ہوتا ۔ اس وقت بھی اخباروں میں درآمدی پالیسی پر لے دے ہو رہی ہے کہ اس سے غیر ملکی تجارت کو ایک قلیل طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز کر دینے کی پہلے سے بھی زیادہ آسانیاں بہم پہنچ رہی ہیں ۔

جب صورت حال یہ ہو کہ حکومت کی امداد اور سرپرستی سے بڑے بڑے صنعت کار اور تجار یوں پیدا ہو گئے ہیں جیسے آسمان سے ٹپک پڑے ہوں اور مزید بہ سرعت تمام پیدا ہوتے جا رہے ہوں ، تو یہ استنباط کرنے کی معقول وجہ نظر آتی ہے کہ پاکستان کے لیے سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام

منزل مقصود کے طور پر چن لیا گیا ہے ۔ یہ سرمایہ دارانہ رجحان برطانیہ کے پرامن طریقے پر سیاسی اقتدار حوالے کر دینے سے پیدا ہؤا ۔ اور یہ رجحان مستقل صورت اس لیے اختیار کر گیا کہ پاکستان کے بانیوں کو اتنی مہلت نہ ملی کہ اپنے دعووں اور وعدوں کو عملی صورت دے سکتے ۔ اور جو اُن کے بعد آئے، انھوں نے اسلامی اقتصادی نظام قائم کرنے کا عوام سے کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا ۔ چنانچہ وہ سرمایہ دارانہ خطوط پر اقتصادی نظام کو قائم کرنے کے لیے آزاد تھے ۔ نہ تو انھیں اس سے بہتر کسی اقتصادی نظام کا علم ہی تھا اور نہ کوئی اس سے مختلف نظام ان کے ذاتی مفادات کو راس آسکتا تھا۔ البتہ صدر ایوب‌خان کے بیانات سے اب بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلامی سوشلزم اور ایک مضبوط درمیانہ طبقے وجود میں لانے کے حق میں ہیں ۔

اس وقت دنیا کے مسلمان سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان شاید برابر برابر بٹے ہوئے ہیں ۔ روسی اور چینی مسلمان سوشلزم کا ذائقہ چکھ چکے اور اس کے طفیل بے حد مادی ترقی سے ہمکنار ہو چکے ہیں ۔ اب ان کے بارے میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اگر اب یا پھر کبھی انھیں انتخاب اور اختیار کا حق دیا جائے، تو وہ سوشلزم کو چھوڑ کر کوئی دوسرا اقتصادی نظام اپنے لیے منتخب کریں گے ۔ اس کے علاوہ البانیہ اور یوگوسلاویہ میں بھی مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے اور وہ بھی سوشلزم پر عمل پیرا ہیں ۔ لیکن مسلمان ممالک کا ایک اور گروہ بھی ہے اور یہ وہ گروہ ہے جس نے انقلابی ذرائع سے استعماری قوتوں سے آزادی حاصل کی اور اپنے مستعمراتی ماضی سے مکمل اور فوری قطع تعلق کر کے سوشلزم کو اپنا لیا ۔

الجزائری مسلمانوں کی جدوجہد کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ انھوں نے پانچ لاکھ سے زائد شہدا کی قربانی دے کر ساڑھے سات سال کی گوریلا جنگ کے بعد آزادی حاصل کی ۔ ۱۹۶۳ء میں انھوں نے اپنے ملک کا آئین بنایا جس کی تمہید میں یہ اعلان کیا گیا کہ " اسلام اور عربی زبان ہی وہ قوتیں ہیں جنھوں نے اس وقت استعماری حکومت کی مؤثر مزاحمت کی جب وہ الجزائریوں کی قومی شخصیت کو نابود کرنے پر تلی ہوئی تھی "۔ الجزائری آئین کی چوتھی دفعہ یہ ہے کہ " اسلام مملکت کا سرکاری مذہب ہے ۔" تاہم اسی آئین کی دفعہ ۹ میں " کمیون " (Commune) کا

لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اہلِ مغرب کی لغت میں قابل نفرین ہے ، اور اس دفعہ کی رو سے "کمیون" کو "علاقائی ، انتظامی ، اقتصادی اور سماجی اجتماعیت کی بنیاد" قرار دیا گیا ہے ۔ اس کی دفعہ ۱۰ میں "اشتراکی جمہوریت کی تعمیر ، اور انسانی استحصال کی تمام شکلوں کے خلاف جنگ" کو "بنیادی عقائد" میں شامل کیا گیا ہے ۔

متحدہ عرب جمہوریہ — مصر ، شام ، عراق — نے بھی اسی سے مشابہ منشور اپریل ۱۹۶۳ء میں "جاگیرداری ، سرمایہ داری ، قدامت پرستی اور سامراج کے گٹھ جوڑ کو تباہ کرنے کے عزم بالجزم کے ساتھ" اپنایا تھا ۔ اس منشور کی دفعہ ۶ یہ ہے کہ "اسلام مملکت کا سرکاری مذہب ہوگا اور عربی سرکاری زبان ۔" دفعہ ۴ کی رو سے "تمام ذرائع پیداوار عوام کے کنٹرول میں" ہوں گے ۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ "انتظامیہ میں کارکنوں کی مثبت شراکت اور پیداوار کے منافع میں ان کا حقیقی حصہ" ہوگا ۔ مزید وضاحت یوں کی گئی ہے کہ "اس کا لازمی نتیجہ تمام ذرائع پیداوار کو قومیانا نہیں" بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ "نجی ملکیت اور نجی سرمایے کو ایسی صورت دی جائے کہ جاگیرداری ، اجارہ داری اور استحصال کا سدباب ہو سکے" ۔ اور یہ کہ اس کی ضرور گارنٹی ہونی چاہیے کہ "نجی سرمایہ عوامی اجازت سے عوامی ضروریات کے مطابق لگایا جائے گا اور اگر یہ استحصال کی یا اپنے مقررہ رول سے ہٹنے کی کوشش کرے ، تو اس کی سرگرمیوں کو ختم کر دیا جائے" ۔ ملکیت اراضی کی بھی ایک معقول حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے کسانوں کے استحصال اور جاگیرداری کی نشو و نما کا سدباب ہو جاتا ہے ۔

عام نقشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن مسلم ممالک نے انقلابی ذرائع سے آزادی حاصل کی ، انہوں نے متبادل نظاموں پر ایک لمحہ غور کیے بغیر سوشلسٹ اقتصادی نظام اختیار کر لیا ۔ بعد کی تبدیلیاں جو غیر ملکی سازشوں کی وجہ سے ظہور میں آئیں ، کچھ اہمیت نہیں رکھتیں اور اُن سے اس عام نقشے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ۔ جو مسلمان سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام پر عامل ہیں ، وہ یا تو پاکستانی مسلمانوں کی طرح ابھی انتخاب کے مخمصے میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کے ہاں بادشاہتیں قائم ہیں ، اور اس لیے انھیں انتخاب یا اس کے متعلق بحث تک کرنے کا

موقع ہی نہیں ملا ، اگرچہ ان بادشاہتوں میں بھی سوشلزم کی گڑگڑاہٹ سنائی دے جاتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا روسی اور چینی مسلمانوں کو اسلامی برادری سے خارج سمجھ لیا جائے ؟ یا الجزائر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے مسلمانوں کو بے دین خیال کرکے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے ؟ ایسا کرنے کا کسے حق پہنچتا ہے ؟ اس کے برعکس یہ امکان نظر آتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو مسلمان رہنا ہے ، تو انھیں سوشلسٹ بننا ہوگا ۔

علماء

عام طور پر علماء سوشلزم کے مخالف ہیں ، جیسے کہ سرمایہ دار بھی مخالف ہیں ۔ مگر سرمایہ داروں کی مخالفت سمجھ میں آ سکتی ہے ۔ ہؤا یہ کہ جب ابوحنیفہؒ اور غزالیؒ کی روح ہم میں کارفرما نہ رہی، تو خود غرض اور مفاد پرست حکمرانوں کی مدد سے اسلامی فقہ اور علم کلام پر تنگ نظری اور استبداد کا پہرہ بیٹھ گیا ۔ فلسفے اور سائنس کی کتابیں نذر آتش کی گئیں او فلسفیوں اور سائنس دانوں کو اذیتیں پہنچائی گئیں ۔ عثمانی حکومت میں رصد گاہیں برباد کی گئیں اور بعض فضلاء کی گردن ماری گئی ۔ طباعت جو مسلمانوں میں آٹھویں صدی عیسوی سے مروج تھی ، اور جسے مسلمانوں نے یورپ میں رواج دیا تھا ، ممنوع قرار دے دی گئی ۔ قسطنطنیہ کے پہلے چھاپہ خانے میں سترہ سال میں بمشکل سترہ کتابیں چھپیں ، آخر ۱۷۴۲ء میں اسے بند کر دیا گیا ۔ اخبار نکالنا تو گویا کھلی اور پوری بے دینی تھی ۔ ۱۸۳۲ء تک کوئی سرکاری عثمانی گزٹ بھی نہیں نکلا ۔ ترکی زبان میں سب سے پہلا غیر سرکاری اخبار ایک انگریز نے ۱۸۴۰ء میں نکالا تھا ۔ عربوں نے سائنس کو جو قومی تحریک دی تھی ، یہ اس کے طفیل تھا کہ بی ۔ آر ۔ ایلٹن (بحوالہ " دی نیو کیمرج ہسٹری " ، جلد ۲ ، صفحہ ۲۸۱) کے بقول سولھویں صدی کی عثمانی سلطنت کی فوجوں کی " تعداد ، تربیت اور جاں نثاری کی کہیں اور مثال نہ ملتی تھی " ۔ یورپ کو ایک " بے دین ملک " (بحوالہ مذکور صفحہ ۹۵ج۲) سے تجارتی راز حاصل کرنے اور اشیاء سازی میں سخت مشکل کا سامنا تھا ۔" طاقتور لیکن سائنسی لحاظ سے جامد ترکی نے اٹھارھویں صدی تک تین براعظموں پر اپنی سیادت کا سکہ جمائے رکھا ۔ لیکن انیسویں صدی میں نوبت بایں جا

رسید کہ اس کے وجود کو بمشکل برداشت کیا جاتا تھا ۔ آزاد ترکی کا وجود اس لیے قائم رہ گیا کہ اسے نیست و نابود کرنے کے متعلق یورپی طاقتوں میں سخت اختلافات پائے جاتے تھے ۔ اور جب ترکی کا بند ٹوٹ گیا ، تو مغربی سامراج کا سیلاب اسلامی دنیا پر چھا گیا ۔ اور اسلامی دنیا کا زوال پورے مشرق کا زوال تھا ۔ جب عالم اسلام پر ادبار کے بادل چھا رہے تھے اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا ، تو علمائے ازہر کافی اور تمباکو کے خلاف ' جہاد ' کر رہے تھے اور ابن خلدون کی تصانیف کے مطالعہ پر پابندیاں لگا رہے تھے !

مضر تبدیلیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان راسخ الاعتقاد ، قدامت پرست طبقے کے مشورے کی قدر و قیمت پہچانیں ۔ لیکن علما کے غیر متبدل اور منفی رویے سے ردعمل پیدا ہونے کا امکان ہے ۔ ہمارے فقہاء اور متکلمین جن کا ہم احترام اور اتباع کرتے ہیں ، وسیع و عمیق علم و فضل کے مالک تھے ۔ ان کی بصیرت، دیانت اور بے نفسی کی انتہا نہ تھی۔ اور ان کی یہ خوبیاں صدیوں کے دبیز پردوں کے نیچے سے بدستور قائم اور درخشاں نظر آتی ہیں ۔ ان کے زمانے میں سائنس اور فلسفے پر صرف مسلمانوں کا عمل دخل تھا ۔ اور جب وہ مذہبی معاملات کے متعلق گفتگو کرتے تھے تو معلومہ سائنسی حقائق اور سماجی اوز سیاسی حالات کے پیش سایوں کو مدنظر رکھتے تھے ۔ ان کی نظر اتنی وسیع تھی کہ ابن خلدون نے الکیمیا یعنی دھاتوں کی قلب ماہیت کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مصنوعی طور پر انسانی نسل پیدا کرنے کے مانند ہے اور " آج یہ علم کہاں موجود ہے ؟" (بحوالہ " مقدمہ " ابن خلدون) ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے عہد میں یہ علم موجود ہوتا ، جیسا کہ آج انجماد منی اور التقاف وغیرہ کی صورت میں موجود ہے ، تو مسلم راسخ الاعتقاد اور قدامت پرست طبقہ اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر رضا مند ہو جاتا ۔

اسلام اور سوشلزم

یہ سچ ہے کہ سوشلزم پر لاش کے قتل کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا کیونکہ جب سوشلزم کا ظہور ہؤا تو مغرب میں مذہب پہلے ہی مردہ ہو چکا تھا ؛ سوشلزم نے اس حقیقت کو صرف باقاعدہ طور پر تسلیم کیا کیونکہ

سوشلزم کو استعماری عزائم سے سروکار نہ تھا ، جن میں مذہب کا غیر روحانی استعمال کیا جا سکتا - بہر حال یہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ سوشلزم کو چکھے بغیر نگلا نہیں جا سکتا -

سوویٹ یونین کو ابھی پرولتاری بین الاقوامیت کے متعلق اپنا دعویٰ تسلیم کرانا ہے - دسمبر ۱۹۶۳ء میں سینکڑوں افریقی طلباء نے ماسکو میں نسلی امتیاز کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے کیونکہ نسلی امتیاز کے باعث ایک روسی نے ایک گھانائی طالب علم کو قتل کر دیا تھا - اس پر افریقی طلباء کو سرکاری طور پر تنبیہ کی گئی کہ یا تو باتمیز رویہ اختیار کریں ورنہ روس سے چلے جائیں - اس تنبیہ کی وجہ سے ان کی احتجاجی کارروائیوں میں نظم و ضبط برقرار رہا - کمیونسٹ بین الاقوامیت ، امریکی شہری حقوق کے قوانین سے کسی طرح بہتر نہیں - نسلی تعصب سے آزادی کی ابتدا انفرادی سطح پر ہونی چاہیے ؛ یہ اوپر سے ٹھونسی نہیں جا سکتی - یہ کہ کوئی فرد نسل پرستی کو از خود اور بے ساختہ طور پر رد اور ترک کر دے ، اس کے لیے مذہبی اعتقادات کی ضرورت ہے ، اور یہ اعتقادات صرف اسلام ہی مہیا کر سکتا ہے -

سوشلسٹ معاشرہ بھی طبقاتی اونچ نیچ سے بری نہیں - فرق صرف یہ ہے کہ اس میں سرمایہ دار کے تشدد کی جگہ پرولتاری تشدد لے لیتا ہے اور حکومت کی باگ ڈور ایک جماعت کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو لوگوں کو شخصی آزادی سے محروم رکھ سکتی اور رکھتی ہے اور جان ، مال اور عزت کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی - اگر سوشلسٹ نظام کامل اور بے عیب ہوتا ، تو وہ لوگ جو سٹالن کی زندگی میں اپنی جانوں کے خوف سے اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتے تھے ، موت کے بعد اُسے یوں بے عزت اور رسوا نہ کرتے -

سوشلسٹ معاشرے کا خالص کردار ، جس پر اب اُس کے حریف یعنی مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشرے کی رشک آمیز نظریں پڑ رہی ہیں ، سخت گیرانہ کٹڑ پن کے ہاتھوں پیدا ہؤا ، اور برقرار رکھا جا رہا ہے ؛ یہ افراد کے ہاتھوں اقدار کے احترام کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا - جب یہ کٹڑ پن پسپا ہوگا ، اور ایک دن ہو کر رہے گا ، تو جس رفتار سے مغربی عیسائی معاشرہ اخلاقی ابتری کا شکار ہؤا تھا ، سوشلسٹ معاشرہ اس سے نسبتاً

زیادہ سرعت سے اس کا شکار ہوگا کیونکہ مغربی معاشرے میں کلیسا کی آواز بتدریج خاموش ہوئی تھی لیکن سوشلسٹ معاشرے میں اس آواز کو نصف صدی پہلے ہی دبا دیا گیا تھا ۔ یہ پھر کبھی سنائی نہ دی اور اب تو اسے پہچانا بھی نہیں جا سکتا ۔

کسی اور نظام نے اپنی بقا کے لیے حکومت کا اس قدر زیادہ سہارا نہیں لیا جس قدر کہ سوشلزم نے لیا ہے ۔ حکومت کی ذرا سی کمزوری بھی کمیونزم کے لیے فنا کا پیغام بن جائے گی ۔ انقلابیوں کی پہلی نسل کے پورے طور پر گزر جانے کے بعد کے تسلسل کا سوال پہلے ہی سے کمیونزم کے لیے اہمیت اختیار کر چکا ہے ۔ کمیونزم جس کی مختلف انواع پیدا ہو رہی ہیں، اور انواع بھی ایسی جنھیں کمیونسٹ بائیل کو توڑ مروڑ کر ہی جائز ثابت کیا جا سکتا ہے ، اس کے مقابلے میں اسلام نے اپنی بدترین بپتا یعنی استعماریت کے زمانے میں بھی ثابت کر دکھایا کہ یہ نہ صرف خود پرور ہے بلکہ خود داسر (Self-propelling) بھی ۔

متحدہ عرب جمہوریہ کے منشور میں اپریل ۱۹۶۳ء میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ سوشلسٹ معاشرے کی منصوبہ بندی کرتے وقت اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا کہ " کارکنوں کو انتظامیہ میں مثبت شراکت اور پیداوار کے منافع میں حقیقی حصہ دلانے کی یقین دہانی کی جائے " ۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ اس کے بعد سوویٹ یونین نے تجرباتی اقدام کے طور پر تینتالیس کارخانوں میں اسے شروع کیا اور اب ایک سال کے بعد پہلے چھ ماہ کے حوصلہ افزا نتائج کی بنا پر اسے آٹھ سو کارخانوں میں نافذ کر دیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ سوشلزم کی تجربہ گاہ ثابت ہو رہی ہے !

متحدہ عرب جمہوریہ کے اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دینے اور سوشلسٹ اقتصادی نظام اختیار کرنے سے کمیونسٹ نظریہ بازوں پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو سوشلزم کی منظوری دیتا ہے ۔ اس سے سوویٹ یونین میں مسلمانوں کی پوزیشن اچھی ہو سکتی ہے ۔ اور اگر کبھی سوویٹ یونین نے مذہب کی طرف رجوع کیا ، یا مذہبی تبلیغ سے پابندی اٹھائی ، تو اسلام کے لیے روشن امکانات اور توقعات ہو سکتی ہیں ۔

کمیونزم کی بنیاد رائے عامہ پر رکھنے ، اس کے کٹڑ پن کو محفوظ

رکھنے اور اسے ایک خود پرور نظام بنانے کے لیے دیر یا بزود اسلام کی خوشہ چینی کرنا ہوگی ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی متبوع خصوصیات اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے مکمل بنانے کی ذمہ دار ہیں۔ اقتصادی عنصر اہمیت ضرور رکھتا ہے، بلکہ یہی بنیادی عنصر ہے ۔ لیکن یہ محض زکٰوۃ کا تصور سامنے لا کر اپنے فریضہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔

زکٰوۃ ایک ٹیکس تھی اور ٹیکس کے طور پر ھی وصول کی جاتی تھی۔ آج کل کے صنعتی حالات میں جلد سے جلد دولت کا اُرتکاز ایک اقلیت کے ہاتھوں میں کرنے کے لیے محنت کشوں کی طرف جو رویہ اختیار کیا گیا ہے، وہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ۔ یعنی " جس مزدوری پر کام کرایا جائے کرو، ورنہ فاقے کرو ۔" یہ رویہ دیدہ و دانستہ افلاس پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے اور اس سے عوام اور محنت کشوں کی اکثریت افراد کی خیرات کا محتاج بن کر رہ جاتی ہے ۔ اور اس خیرات پر بھروسا بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ خیرات ملتی بھی نہیں ۔ یہ صورت حال ویسے بھی وقار اور عزت نفس کے منافی ہے ۔ اگر زکٰوۃ اور صدقہ برضا و رغبت دیے جاتے رہتے، تو ہم سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان ٹامک ٹوئیے نہ مارتے رہتے ۔ ہمارے مسئلے کا حل یہ ہے کہ زمین اور دیگر ذرائع پیداوار کو قومیا دیا جائے ۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایک غیر سرکاری سیکٹر کو بھی متعین حدود کے اندر پنپنے کا موقع دیا جائے ۔

قومیائیت اور دینیات

اگر قومیائیت اسلامی نظریات کے خلاف ہوتی، تو اقتصادی زندگی کے لحاظ سے امریکہ بہترین اسلامی ملک ہوتا، اور اس لیے قابل تقلید نمونہ ؛ ویٹ نام، روڈیشیا، جنوبی افریقہ، اسرائیل وغیرہ اس نمونے کے مختلف رخ ہوتے ۔ اور ان کے علاوہ بھی بہت سے کریہہ رخ ہوتے مثلاً نسل پرستی، قابل خرید سینیٹروں اور کانگرسی ارکان وغیرہ کے ذریعے سے حکومت، جن کا ذکر مارٹن نے کیا ہے ۔ اگر ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کے عمل کے علاوہ ہمیں قومیائیت کی بعض تازہ مثالیں بھی ملتی ہیں جو کافی یقین بخش معلوم ہوتی ہیں ۔

اسلام کے زمانۂ عروج میں آزاد اور غلام سبھی مفت تعلیم پاتے تھے ۔

” جب کوئی نووارد کسی اسلامی شہر میں داخل ہوتا تھا ، تو اُسے یقین ہوتا تھا کہ شہر کی جامع مسجد میں دن کی تقریباً ہر ساعت میں وہ کوئی عالمانہ تقریر سن سکے گا ۔ عام طور پر کوئی تعلیمی فیس نہیں لی جاتی تھی ، اور اگر تھی بھی تو وہ اتنی کم ہوتی تھی کہ ہر شخص ادا کر سکتا تھا ، بقیہ اخراجات اصحاب خیر برداشت کرتے تھے ۔ اکثر ابن السبیل قسم کے طلبا نہ صرف مدرسوں میں مفت تعلیم حاصل کرتے تھے ، بلکہ کچھ عرصے تک ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی مفت ہوتا تھا “ ۔ (ول ڈیورانٹ ۔ ” ایج آف فیتھ “۔ صفحہ ۶-۲۳۵)

” ۱۲۸۳ء میں سلطان قولون نے مارستان المنصور کی بنیاد رکھی جو قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال تھا ۔ اس میں مختلف امراض کے لیے الگ الگ وارڈ تھے ۔ رو بصحت مریضوں کے وارڈ بھی الگ تھے ۔ متعدد لیبارٹریاں ، ایک ڈسپنسری ، بیرونی مریضوں کا کلینک ، پرہیزی غذاؤں کا کچن ، کئی غسل خانے ، ایک کتب خانہ ، عبادت خانہ ، اور لیکچر ہال بھی تھے ۔ دماغی مریضوں کے مخصوص وارڈ کی فضا خاص طور پر خوشگوار تھی ۔ عورتوں ، مردوں ، امیروں ، غریبوں ، غلاموں ، آزادوں ، سب کا علاج مفت کیا جاتا تھا ۔ اور رو بصحت مریض کو ہسپتال سے رخصت کے وقت ایک مقررہ نقد رقم بھی دی جاتی تھی تاکہ وہ فوراً ہی کام پر جانے کی ضرورت محسوس نہ کرے “ ۔ (بحوالہ مذکور صفحہ ۳۳۰)

پندرھویں صدی میں مصر کا مملوک سلطان سرکاری طور پر تجارتی اجارہ داری رکھتا تھا ۔ انیسویں صدی میں محمد علی پاشا نے مصر میں تمام زمین کو قومی ملکیت بنا دیا تھا ۔

ان روایات ، نظائر اور احکام کی روشنی میں تاریخ کا طالب علم یقین کرنے لگتا ہے کہ اگر مسلمانوں کی سائنسی کوششیں مشین کی منزل تک جاری رہتیں تو وہ کسی قسم کی ہلچل پیدا کیے بغیر سوشلسٹ اقتصادی نظام پر منتج ہوتیں ۔ البتہ اس نظام پر مارکسی چھاپ نہ لگی ہوتی ۔ پروفیسر برٹرینڈ لوئس کے بقول اسلام میں ” ذہین اور صاحب استعداد لوگوں کے لیے ذرائع معاش کے دروازے کھولنے کے لیے انقلاب کی ضرورت نہیں تھی “ ؛ یہ خصوصیت تو اسلام میں شروع سے موجود تھی ۔ اس کی دوسری اور زیادہ قوی وجہ یہ ہے کہ خلافت کی بنیاد جمہوریت

پر رکھی گئی تھی ، اور کم سے کم اپنے اصولوں کے لحاظ سے یہ جمہوری رہی بھی - اسلام کے عطا کردہ حقوق اور آزادیوں کی بیخ کنی نہ تو خلافت کو گوارا ہوتی اور نہ علماء اسے برداشت کرتے کہ محنت کشوں کو دست و پابستہ، استحصال کے لیے، سرمایہ دار کے حوالے کر دیا جائے -

پاکستان میں جب تک پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے سرکاری سرمایے سے قائم کردہ صنعتیں آسان شرائط پر مختلف اشخاص کے حوالے نہیں کر دی تھیں ، ہم یقیناً نامسلم نہ تھے اور نہ ہم اس لیے جزوی طور پر مسلمان ہیں کہ سڑکی نقل و حمل کو جزوی طور پر قومیا دیا گیا ہے ، یا اس لیے کہ امریکہ کے برعکس پاکستان میں بڑے بڑے منصوبے مثلاً ریلوے ، تار اور ڈاک ، ریڈیو اور اسلحہ سازی حکومت پاکستان کی ملکیت ہیں ، اور حکومت ہی انہیں چلاتی ہے - اگر اکثر یا سب کی سب بڑی صنعتیں اور منصوبے قومیالیے جائیں ، تو اس سے ہماری اسلام سے عقیدت اور وابستگی کو ضعف نہیں پہنچے گا ، بلکہ یہ پہلے سے مضبوط تر ہو جائے گی -

سوال یہ ہے کہ کیا ہم خدا سے بیگانہ کمیونزم کا مقابلہ کرکے اسے اپنے اندر جذب کر لیں گے یا خدا نخواستہ اپنی غفلت شعاری سے جدید مزدکیت کا شکار ہو جائیں گے ، جو ہمارے آس پاس ہی حملے کے لیے تیار اور موقع کے انتظار میں چھپی بیٹھی ہے ؟

ترجمہ : بشیر ساجد

* * *